U87690 12

Title - SAAT KHEL

Creator - Rajendra Singh Bedi.

Publisher - Maktaba Jamia (New Delhi).

Date - 1946

Pages - 232

Subject - Urdu Drama.

سات کھیل

راجندر سنگھ بیدی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر، نئی دہلی 110025 ، اردو بازار، دہلی 110006

پرنسس بلڈنگ، بمبئی 400003 ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ 202001

پہلی بار ۱۹۴۶ء

دوسری

~~پہلی~~ بار : جون ۱۹۸۱ء   تعداد 1000   قیمت : 17/50

برٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں طبع ہوئی۔

فہرست

خواجہ سرا

کاشفہ ، اُردا بیگنی، محل میں ڈولیوں کی تنقیح کرتی ہے
قباد ، خواجہ سرا
مرزا کوچک سلطان ، نواب ثالث زمانی بیگم کا چھوٹا بھائی
نواب ثالث زمانی بیگم ، } بیگمات نواب کاؤس شاہ
نواب ننھی بیگم ،
نواب کاؤس شاہ ،
داروغنی ،
بابا طاہر ، شاہی طبیب
تین ڈولی بردارنیاں ، سقنی ، نوکر چاکر

وقت ، زوالِ مغلیہ خاندان

پہلا منظر

حرم کا بیرونی دروازہ سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے اور مغلیہ صنعت کا اچھا نمونہ ہے۔ دروازے کے عین بغل میں ایک پانی کی پکھال دکھائی دیتی ہے جس سے پانی نیچے باولے ــــ ایک حوض میں گر رہا ہے۔ کبھی کبھی کوئی سقنی پانی بھر کر حرم میں لے جاتی ہے۔

پردہ اُٹھنے پر اُردا بیگنی ایک پاؤں باولے پر رکھے، داہنے ہاتھ کی کہنی گھٹنے پر ٹکائے اسی ہاتھ کے انگوٹھے اور انگشتِ شہادت میں اپنی ٹھوڑی لیے خلا میں گھور رہی ہے۔ اس کے سر کے بال بکھرے ہوئے ہیں اور دوپٹہ لاپروائی سے گلے میں پڑا ہوا ہے ــــ وہ فقط ایک قمیص اور ایک چوڑی دار پایجامہ پہنے ہوئے ہے۔

اُردا بیگنی کو اس جگہ اور اس حالت میں کھڑے کچھ دیر ہوتی ہے کہ دارو غنی، ایک ادھیڑ عمر، سیاہ فام عورت ایسے ہی لباس میں اس طرف سے گزرتی ہے۔ اُردا بیگنی اس وقت گنگنا رہی ہے۔

اُردا بیگنی۔

دانی کہ چہ بد نیست اے دلبرِ ما ــــ یا این جہتے نرفت از برِ ما
خود کس را نفرستی و نپرسی ہرگز ــــ تا بتو چہا می گزرد بر سرِ ما

(دارو غنی ہانپتی ہوئی آتی ہے)

دارو غنی: اُردا بیگنی ــــ اُردا بیگنی ــــ کا شغفہ! اری! تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو؟
اُردا بیگنی: (چونک کر) کیوں؟ کیا ہے دارو غنی بی؟

داروغنی: کیا ہے؟ تعجب ہے محل میں زنانہ سواریاں آیا چاہتی ہیں اور تم پکھال کے پاس کھڑی کیا مزے سے کہہ رہی ہو ـــ کیا ہے؟ ـــ اری آج ڈولیوں کی تنقیح نہیں ہوگی کیا؟

اُردابیگنی: اوہ! ڈولیاں بھی آنے والی ہیں؟ ـــ داروغنی بی، اللہ جانے آج مجھے کیوں چکر سے آرہے ہیں۔ رنگا رنگ حلقے میری آنکھوں کے اردگرد کھیل رہے ہیں ـــ یہ باولا ہے نا ـــ پانی کی پکھال ـــ اور بس، اس سے آگے مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ تنقیح کیا ہوگی، خاک؟

داروغنی: چکر سے آرہے ہیں ـــ اوئی! اب میں نے جانا کیوں ہوائیاں چھوٹ رہی ہیں ـــ تمھارے چہرے پر... قباد کو دیکھے کے دن ہوئے ہیں تمھیں؟

اُردابیگنی: قباد ـــ قباد ـــ للہ اس کا ذکر نہ کرو، داروغنی بی!.... تم نے قباد کا نام لیا اور میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ اب تم سے کیا چھپاؤں خالہ! گھڑیوں ایک ٹک دیکھتی رہتی ہوں گولندازوں کے محلے کی طرف ـــ مہینوں سے قباد نے وہاں آنا چھوڑ دیا ہے اور یہاں وہی رسم وفا ہے اور وہی خلجان!..... دیکھو خالہ! اگر کوئی باریدارنی نظر پڑتی ہے تو اُس سے کہہ دو گلی سے میری کیانی اچکن اور انگرکھا لے آئے..... ـــ ذرا جلدی آجائے۔ ڈولیاں آرہی ہیں (گھبرا کر) گھنٹیوں کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں.....

(گھنٹیوں کی دھیمی دھیمی آوازیں سنائی دیتی ہیں)

داروغنی: قباد کو دیکھوگی ـــ کاشفہ! تو تمھارے دل میں اور ٹیسیں اٹھیں گی. ـــ نادان چھوکری، نیا فرمان دیکھ لیا تم نے؟

اُردابیگنی: نہیں تو ـــ نئے فرمان میں خاص کوئی وہ ہے؟

داروغنی : ہے تو وہی روزمرّہ ــــ لیکن ایک بات ہے۔ مرزا دبیر کو احسن الدولہ کا خطاب عنایت کیا گیا ہے اور خلجی سردار قویش کو ایک ہزاری منصب۔ اور ہاں! محل میں ایک نیا خواجہ سرا آرہا ہے جو تمھیں . . . . . اری! میں کیا کسی پتھر کے بُت سے باتیں کر رہی ہوں ؟

(گھنٹیوں کی آوازیں اور قریب ہو جاتی ہیں)

اُردا بیگنی : مجھے اس وقت کچھ ہوش نہیں ہے خالہ! ــــ اور ڈولیاں آرہی ہیں

داروغنی : اب کس سے کہوں تمھاری اچکن لاتے کے لیے ؟ نہ یہاں سقنی دکھائی دیتی ہے اور نہ باربردارنی۔ البتہ وہ خیر صلاّ والی گھوم رہی ہے ــــ بے حیا کی بلا دور، یہ لومڑی پھر لگائی بجھائی کرنے آئی ہوگی ــــ اری او خیر صلاّ والی!

(وقفہ)

اُوں ہُوں! کیسی چھنٹی ہوئی عورت ہے۔ کس مزے سے رنگ جماتی ہے، جیسے میری آواز ہی نہیں سنی۔ نہیں جانتی ہیں اس کی فیز تک سے واقف ہوں۔ اجی سرکار! ایک عرض بندی کی بھی سنیے گا، اے ہے!

اُردا بیگنی : خالہ! تم خود جاؤ اور لے آؤ ــــ سواریاں بھی آگئیں ــــ جا جلدی ذرا . . . . اچھی بہن . . . .

(داروغنی جاتی ہے اور مطلوبہ لباس لے کر لوٹ آتی ہے۔ اس وقت اُردا بیگنی سخت گھبراہٹ میں کپڑے پہننا شروع کر دیتی ہے)

(داروغنی سے) پہنا دو ــــ باندھ دو تکمہ ادھر بھی ــــ ہاں ہاں بس داروغنی بی ڈولی آگئی ــــــــ

(گھنٹی کے ساتھ پہلی ڈولی سامنے آتی ہے)

داروغنی: لو، پردہ تھام لو۔

اُردا بیگنی: بلند اقبال نواب ثالث زمانی، ان کی صاحبزادی چھٹی نویسی اور آچا ہیں۔ اللہ رسول کی امان! بیگم! لونڈی سلام عرض کرتی ہے۔

نواب ثالث زمانی: کہو کاشفہ! اچھی تو ہو؟ یہ میرے ساتھ صاحبزادی اور دوسری ان کو پڑھانے والی آچا، ہیں۔ یہ نئی ہی آئی ہیں لکھنؤ سے (آچا سے) آچا بی! یہ اُردا بیگنی ہیں — ان کا کام یہاں ڈولیوں کی تنقیح ہے۔ ہر روز ادھر آنے سے پہلے ان سے ملاقات ہوا کرے گی تمھاری۔

اُردا بیگنی: خوش آمدید! یہ تو بہت اچھا ہوا محل کی رونق میں اور بھی اضافہ ہوا۔ اللہ صاحب زادی نیک اختر کو عمر دراز عطا کرے۔ ان کے صدقے ہمیں بھی بڑے بڑے آدمیوں کا نیاز حاصل ہوا۔

نواب ثالث زمانی: اور کاشفہ! تمھاری والدہ نواب اچھی ہیں نا؟

اُردا بیگنی: حضور کی لاانتہا کرم فرمائیوں کی بدولت اچھی ہیں۔ وہ آپ کا ارشاد کردہ جوشاندہ پلا دیا تھا اور اب تو کھانسی کو افاقہ ہے..... اور ہاں فرمایئے — مرزا کوچک اچھے ہیں۔ پچھلے دنوں دشمنوں کی طبیعت کے ناشاد ہونے کا خط آیا تھا۔

نواب ثالث زمانی: ہاں کاشفہ — بھائی مہم پر جاتے ہی نصیب دشمناں بیمار ہو گئے، بہت بارشوں کی وجہ سے بنگلہ کی زمین سے نکلنے والے بخارات کی لپیٹ میں آ گئے۔ اب ان دنوں فتحیاب ہو کر لوٹا ہی چاہتے ہیں — چھٹی نویسی کو انھیں ہی خط لکھنے کے لیے لائی ہوں۔

(دوسری ڈولی سامنے آتی ہے)

داروغنی: لو، پردہ تھامو، اُردا بیگنی!

اُردا بیگنی: بخت بلند نواب ننھی بیگم — اللہ رسول کی امان! بیگم غلام تسلیمات

عرض کرتی ہے (سخت حیران ہوکر) قباد! ـــ قباد ـــ!!
نواب ننھی بیگم: ہاں اردابیگنی۔ یہ ہمارے نئے خواجہ سرا ہیں۔ آئیں ہائیں! یوں ششدر کیوں رہ گئیں۔ جانے سل بٹہ ہو گئیں تم۔ نئے فرمان ہیں تم نہیں دیکھا خواجہ قباد کا ـــ؟ تعجب ہے ـــ داروغنی!
داروغنی: ہاں نواب صاحبہ ـــ نام تو کب کا شائع ہو چکا تھا۔ لیکن خدا جانے اردابیگنی کو کیوں نہیں بتایا گیا؟ میں تو آج ہی اسے فرمان سنا رہی تھی لیکن....

(ڈولیاں حرم میں چلی جاتی ہیں)
اردابیگنی: ڈولیاں چلی گئیں ـــ قباد ـــ قباد خواجہ سرا ہو گیا۔ داروغنی! تمھاری کاشفہ پاگل ہو جائے گی ـــ قباد نے یہ کیا کیا ـــ قباد نے یہ کیا کیا۔
داروغنی: تم نہیں جانتیں کاشفہ ـــ قباد کو تم سے کتنی محبت تھی۔ وہ تمھارے کتنا قریب ہونا چاہتا تھا وہ چوگان محبت میں تم سے گوئے سبقت لے گیا۔ تمھاری محبت کا یہ عالم ہے کہ شاہی محل سے نکل کر گولندازوں کے ہاں تک بھی نہ پہنچ سکیں جہاں وہ ساری ساری رات منڈلایا کرتا تھا اور نواب ثالث زمانی کو اکثر شجاعت خاں کے بھوت کا دھوکا ہوتا ـــ کئی اندھیری راتیں، کئی چاندنی راتیں گزر گئیں اور وہ برابر گولندازوں کے ہاں آیا کیا ـــ اور تم، تم پانی کی پکھال سے آگے نہ بڑھ پائیں ـــ!
اردابیگنی: قباد! تو نے یہ کیا کیا ـــ تم نے محبت پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ قباد تو ہمیشہ سچی اور پاک محبت کا نام لیا کرتا تھا ـــ سچی اور پاک محبت جس میں جسم کو کوئی دخل نہیں ـــ قباد! میں پاگل ہو جاؤں گی۔

داروغنی :۔ اب شجاعت خاں کے بھوت کو گولنداز وں کے ہاں منڈلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب وہ نواب ثالث زمانی بیگم کے بغلی کمرے کے پاس جہاں اُردا بیگنی کا حجرہ ہے منڈلایا کرے گا ——— لو کاشفہ! میرے خیال میں وہ شجاعت خاں کا بھوت آرہا ہے۔ شجاعت خاں کا بھوت! ——— میں جاتی ہوں۔

(ایک طرف غائب ہو جاتی ہے دوسری طرف سے قباد آتا دکھائی دیتا ہے)

اُردا بیگنی : قباد ——— قباد!

قباد : (قریب ہو کر) کاشفہ! میری اپنی کاشفہ!

اُردا بیگنی : قباد تم ہو ——— قباد! میرے کم سن محبوب ——— تم نے یہ اقدام کیوں کیے۔ تم نے یہ اقدام کیوں کیے ——— بتاؤ بتاؤ!

قباد : اپنی کاشفہ کے قریب ہونے کے لیے ——— قریب تر ہونے کے لیے۔ وہاں محل کے نیچے منجمد کر دینے والی سردی تھی کاشفہ! وہاں پانی اور کیچڑ تھی جس میں سردیوں کی لمبی راتیں پھنس کر رہ جاتی تھیں۔ یہاں مونگ اور سن کی فصیلیں ہیں اور تمھارا گرما دینے والا حسن، کاشفہ!

اُردا بیگنی : آہ قباد! میرے معصوم محبوب! تو نہیں جانتا تو نے کیا کیا ہے، تیری معصومیت کے صدقے! میں تیری قربانی کا جواب قربانی سے دوں گی لیکن ——— (نفرت سے) خواجہ سرا قباد! مجھے یقین نہیں آتا کہ تم ایسی ذلیل حرکت پہ کیسے اُتر آئے؟ ——— تم عورت ہی ہوتے ——— اب تم مرد ہو، نہ عورت ——— تم کیا ہو تم کچھ بھی نہیں ہو۔ (محبت سے) لیکن آہ! قربان جاؤں تمھارے بھولپن کے، میرے قباد! ——— اِدھر دو مجھے اپنا ہاتھ ——— (چیخ مار کر) آہ! مجھے اس سے کتنا ڈر لگتا ہے۔ اس برف ایسے ٹھنڈے اور منجمد ہاتھ سے

قباد : (آواز بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے) اسے ہے کاشفہ!

اُردابیگنی : اُف میرے اللہ! تمھارا لہجہ کس تیزی سے بدل رہا ہے، اس سے پہلے تم کتنے دُبلے پتلے انسان تھے۔ اب گوشت تمھارے جسم اور تمھاری گردن پر جمع ہو رہا ہے (روتے ہوئے) قباد! مونگ اور سن کی ان فصیلوں میں نواب بلند بخت آئے، نواب کاؤس شاہ آئے اور ھزرائے کوچک سلطان بھی آتے ہیں ــــ لیکن تم ایسے آئے کہ گولندازوں کے ہاں کی کیچڑ بھی ساتھ ہی لیتے آئے، جس میں کاشفہ کا کرما دینے والا حُسن بھی سردیوں کی لمبی راتوں کی طرح پھنس کر رہ جائے گا ــــ قباد ــــ قباد ــــ تم نے یہ کیا کیا؟

قباد : میں تم سے کل کی بات کہنی ہوں ــــ کہتا ہوں، کاشفہ ــــ کل جو کہ اب عدم آباد والوں کا حصّہ ہو چکا ہے۔ کل جب کہ مجھ میں مرد کا صائب حسد زندہ تھا اور جب میں نے ھزرائے کوچک کو دست بدست لڑائی میں زخمی کیا تھا اور ابھی اپنے نئے پیشے کی تعلیم پانے کے لیے خواجہ سراؤں کے ہاں نہیں گیا تھا۔ ھزرائے کوچک نے حضرت علی کی نیاز کے روز ایک مشروع کا تھان اور مونگے کی مالا دی اور وہ میری برداشت سے باہر تھی۔ میں جانتا تھا کہ تم بھی مشروع میں ملبوس ہو کر اور مالا میں محض ایک مونگا بن کر لٹک جاؤ گی۔ . . . خواجہ سراؤں کی آمدنی کے پیش نظر مجھے خیال تھا کہ میں تمھیں ایک موتیوں کی مالا نذر کر سکوں گا موتی جو مونگے سے گراں تر ہوتے ہیں اور تم موتی بن کر لٹکنا زیادہ پسند کرو گی۔ . . .

اُردابیگنی : تم کس قدر بھولے ہو قباد! عورت خواہ مونگا بن کر لٹک جائے خواہ موتی بن کر لٹکنا وہیں رہتا ہے۔ میرے محبوب! عورت دولت نہیں چاہتی۔ جاہ و حشمت کی طلبگار نہیں ہوتی۔ وہ محبّت چاہتی ہے لیکن۔ . . . لیکن محبّت کسے کہتے ہیں۔ یہ تم نہیں جانتے، شاید یہ میں بھی نہیں جانتی۔

قباد : مجھے تم سے محبّت ہے ـــــ پاک اور بے لوث محبّت ! میں سمجھتا ہوں کہ تمھیں بھی مجھ سے بے غرض محبّت ہوگی۔ تم میری قربانی کا جواب قربانی سے دینے کا وعدہ کرتے ہوئے وفا کی لاج بھی رکھ رہی ہو اور نفرت بھی جتا رہی ہو . . . . لیکن اس میں تمھارا کیا قصور ہے کاشفہ ! . . . . .

آزاد بیگمی : جسے تم محبّت کہتے ہو، وہ محبّت نہیں ہے ـــــ رفاقت ہے۔ جیسے دو مسافر ایک ہی منزل کو روانہ ہوں اور انھیں منزل کے ایک ہونے کی وجہ سے ایک طرح کی محبّت ہو جائے جیسے ایک انتہائی بدصورت انسان کی صورت سے کوئی اتنا مانوس ہو جائے کہ اس سے خوف کھانے کی بجائے اس سے انس ظاہر کرنے لگے . . . لیکن تمھارے اس فعل کے پیچھے جو خلوص ہے میں اس کی قدر کرتی ہوں ـــــ قباد ! . . . لیکن . . . . قباد ـــــ

قباد : (روتے ہوئے) میں کچھ نہیں جانتا ـــ میں اس وقت نہیں جاننا چاہتا کہ میں نے کیا کیا ہے، کاشفہ ! ـــــ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ میں تمھیں چاہتا ہوں ـــــ اور . . . . . .

(پردہ)

دوسرا منظر

حرم کا اندرونی منظر۔ نواب ثالث زمانی کے محل کا ایک کشادہ سا کمرہ جس کا ماحول پردوں اور ہر قسم کے ساز و سامان کے اعتبار سے نہایت پُر تکلف ہے۔ سامنے دو تین سیڑھیاں ایک بڑے مسند کے ساتھ ملحق ہوتی ہیں۔ اس مسند پر بیسیوں گاؤ دم تکیے اور کئی ایک پیچوان اور گلوریاں دکھائی دے رہی ہیں۔

پردہ اُٹھنے پر دروازے کے قریب بار بردارنیاں حکم کی منتظر کھڑی نظر آتی ہیں۔ اور بیگمات کھڑکیوں سے نیچے ایک جلوس کو دیکھ رہی ہیں۔ یہ جلوس مرزائے کوچک کے محلوں میں فاتحانہ داخلے کے سلسلے میں ہے۔ اس لیے نفیریوں اور شادیانوں کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دیتی ہیں:

ایک آواز: نواب کوچک سلطان فاتح بنگلہ زندہ باد!

دوسری آواز: دولت کاؤس شاہی پائندہ باد!

ساتھ کے کمرے میں عورتیں گا رہی ہیں۔

"نریوے مبارکبادیاں ری مائی جھم جھم تت تت"

نواب ننھی بیگم: (کھڑکی سے سر نکالتے ہوئے) مبارک ہو بہن ثالث — سچ کہتی ہوں، مجھے تو تم پر رشک آتا ہے۔

دارو غنی: بیگم سچ فرماتی ہیں — اللہ کرے نواب کوچک کا سا بھائی ہر کسی کا ہو۔

مُرداسِنگنی: میں پہلے نہ کہتی تھی بیگم ـــ مرزا کوچک بڑے شہزور آدمی ہیں اور بنگلے کی مہم میں ضرور کامیاب رہیں گے۔
نواب ثالث زمانی: اپنوں کو خوشی نہ ہوگی تو کیا دوسروں کو ہوگی؟ جب کوچک بھائی یہاں پڑے انڈے مرغیوں کے لڑایا کرتے تھے تو نواب صاحب کا یہ خیال ہو چلا تھا کہ یہ بس انڈے لڑانے ہی تو جانتے ہیں۔
نواب ننھی بیگم: ان کی کیا بات کرتی ہو، ثالث بہن! بیٹھے بٹھائے پھبتیاں کسنا تو ان کا کام ہی ہے ـــ اور جو میں ان سے اِتّی وہ نہ کروں تو ہر روز میرے سر پر چکّی دَلا کریں ـــ سچ!
ثالث زمانی: ہاں ننھی ـــ وہ تو ان کی بات ہی ہے۔
ننھی بیگم: اری بی قباد! ـــ جا تو میرا پاندان اُٹھا لا۔
خواجہ قباد: جاتی ہوں بیگم صاحبہ ـــ پان تراش بھی لاتی ہوں۔ سموسہ گلوری لاؤں یا کھلی؟
ننھی بیگم: میرے لیے تو سموسے لے آؤ یا تعویذی اور ـــ ثالث بہن کیا لیں گی؟
ثالث زمانی: بیڑا لوں گی اور کیا؟ ـــ لیکن دیکھو اتنا چونا نہیں لگانا جتنا اُس روز لگایا تھا مُنہ کا ایک کلّہ آج تک سوجا ہوا ہے۔
خواجہ قباد: بیڑا وہ کاٹ کے لاؤں گی کہ بیضہ ماند پڑ جائے اور نہیں تو ـــ
مُرداسِنگنی: (آہستہ سے) قباد! خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو ....
ننھی بیگم: اور دیکھو بی قباد! ـــ آج آخری چہار شنبہ ہے انگوٹھی اور چھلّے بھی لیتے آنا، آج خیر سے کوچک میاں کو بھی ایک انگوٹھی دوں گی۔

(قباد جاتا ہے)

ثالث زمانی: اور ہاں، دو گی کیوں نہیں؟ پچھلی دفعہ سر ہو رہا تھا کہ آپا ننھی بیگم

مجھ سے ناحق تنی رہتی ہیں۔

اُردا بیگنی: وہ تو ایسے نہیں ہیں بیگم جو ذرا سی بات پہ مُنہ کو آئیں ـــــ وہ جو کام کبھی کریں ایک قرینے کے ساتھ۔ انڈے لڑا دیں تو اس میں بھی شاہانہ شان ٹپکے ـــــ جن میں بازو کا زور ہوتا ہے وہ نہیں ہوتے خفا ان چھوٹی چھوٹی باتوں پہ ـــــ۔

ثالث زمانی: ہاں کاشفہ! ـــــ لو کوچک میاں آگئے۔

(استقبال کے لیے اُٹھتی ہے اور سیڑھیوں سے نیچے آتی ہے ایک طرف سے کوچک میاں داخل ہوتے ہیں۔ ہاروں سے لدے پھندے ہیں۔ سر پہ دوپلّی آڑی رکھی ہوئی ہے۔ ذرا بانکے دکھائی دیتے ہیں۔ ہاتھ میں ہمیشہ کی طرح ایک انڈا ہے)

ثالث زمانی: اب طبیعت کیسی ہے کوچک میاں؟ ـــــ سُنا تھا پچھلے دنوں طبیعت خراب تھی۔

نواب کاؤس شاہ: خیر سے بھلا چنگا ہے۔ ایک دن کچھ سر میں درد ہوا تھا اور بس ـــــ تم عورتیں بھی خوب رائی کا پہاڑ بنا لیتی ہو واللہ!

مرزائے کوچک: ٹھیک کہتے ہیں نواب۔

ننھی بیگم: اونہہ! آپ کی تو عادت ہے کہ بات مُنہ سے نکلی نہیں اور پکڑ لی۔

نواب کاؤس شاہ: اچھا بھلا جو مُنہ میں آئے کہے جاؤ ـــــ

ننھی بیگم: اچھا، تو میں چُپ ہو جاتی ہوں، میری باتیں کہاں اچھی لگتی ہیں آپ کو!

کاؤس شاہ: ثالث کو بہت بولنا چاہیے اور وہ چُپ ہیں ـــــ مبارکباد بھی نہیں دے سکیں بھائی کوچک کو ـــــ۔

ثالث زمانی: (گلے میں رقّت ہے) مجھ سے بولا نہیں جاتا ـــــ۔

نواب کاؤس شاہ : اوہ! اتنی خوشی ہے واللہ کہ رو رہے ہیں۔
(سب ہنستے ہیں)
ثالث زمانی : یہ آپ ہی تھے جو کہتے تھے کہ بس انڈے لڑانے ہی آتے ہیں کوچک میاں کو۔
کاؤس شاہ : اوہ! رگ یہ دکھ رہی ہے ــــ؟
مرزا کوچک : وہ تو مذاق میں تھا ــــ آپا جان!
ثالث زمانی : جی ہاں، جانتی ہوں۔
نواب کاؤس شاہ : یہ لو ــــ ارے بابا! ان عورتوں سے خدا بچائے۔ یہ وہ ہیں جو کنوئیں میں گرے ہوئے عاجز کا نکیلا بٹہ لے کر پہنچ جاتی ہیں ــــ ارے بابا! ابھی ننھی سر ہو رہی تھیں، اب تم جوتے لگاؤ۔
ثالث زمانی : آئے ہائے! میں کیوں دشمنوں کے جوتے لگانے لگی؟
نواب کاؤس شاہ : ہاں ہاں! "دشمنوں" کو کیوں لگانے لگی؟
(سب ہنستے ہیں)
مرزا کوچک : تم تو اپنی اپنی ــــ گویا برسوں کی لے بیٹھے ہو۔
کاؤس شاہ : اللہ ہی بچائے۔ اب تو کفر کی چل نکلی ہیں ــــ۔
ننھی بیگم : خود ہی واویلا کرتے ہیں اور خود ہی ڈرتے ہیں ــــ مگر ان سے کون کہے؟
مرزا کوچک : (ہنستے ہوئے) اور کہہ بھی دیا ــــ کیا ادا ہے۔
ننھی بیگم : چلو چھوٹے میاں ــــ آج ہی آئے اور آج ہی . . . .
ثالث زمانی : ارے چھوٹے میاں ــــ کوئی ہنگامہ کی کہو ــــ۔
کاؤس شاہ : ڈینگیں چل نکلیں گی، بیگم ــــ یہ خیالِ شریف میں رہے۔

ننھی بیگم : مشکل سے جان چھڑا کر آیا ہے اور بہن ثالث اسے پھر بنگلہ کی یاد دلا رہی ہیں ——— کچھ سنانے تو دو ———

کاؤس شاہ : یہیں بنگلہ کا رٹ نہ پڑ جائے۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔

ثالث زمانی : اور نہیں تو کاشفہ کو کہتی ہوں ——— وہ کچھ سنائے۔

اُردا بیگنی : (شرماتے ہوئے) بیگم صاحبہ! مجھے گانا نہیں آتا۔

کوچک سلطان : (حیران ہو کر) اُردا بیگنی ——— کاشفہ! (اپنے آپ سے) کیا رنگ نکالا ہے! کاشفہ! ——— یہ تیری محبت تھی جو ———

ثالث زمانی : چل ہٹ! گانا نہیں آتا۔ چار پانچ روز سے وہ سر کھایا ہے . . . . وہ مشق کی ہے کہ . . . . اور اب ——— ۔

ننھی بیگم : مُنہ پہ تعریف گالی برابر ہوتی ہے۔ لیکن کہاں اُردا بیگنی اور کہاں عمر خیام کی رباعیات ——— اللہ کی دین ہی تو ہے ——— اور پھر کیا گلا پایا ہے!

ثالث زمانی : ۔ ایرانی نژاد ہے آخر ——— اس کے دادا کو ابھی تک لشکری نہیں آتی۔

کاؤس شاہ : اُردا بیگنی ——— گاؤ، ہم تمھیں دوشالہ دیں گے۔

مرزائے کوچک : مشروع کا تھان دیں گے۔

اُردا بیگنی : (مرزائے کوچک کی طرف دیکھتے ہوئے) پہلے ہی حضور کی جوتیوں کے صدقے کیا تھوڑا ہے؟

کاؤس شاہ : داروغنی ——— ۔

داروغنی : حکم سرکار!

کاؤس شاہ : اِس کٹوری میں تمبا کو کم ہے۔ جا اور تمبا کو لے آ ——— (قدموں کی آواز)

خواجہ قباد : (داخل ہوتے ہوئے) لیجیے حضور پاندان:

کاؤس شاہ : بیگم : نیا خواجہ سرا کیسا ہے؟

ننھی بیگم :۔ اچھا ہے (ایک طرف ہو کر) اکیلے میں بتاؤں گی۔
مرزائے کوچک :۔ اور ہم کیا پرائے بیٹھے ہیں جو ہم سے چھپاتی ہو، آپا؟
ثالث زمانی :۔ تعجب ہے ——!
ننھی بیگم :۔ ایسی بھی باتیں ہیں . . . . جو مردوں سے چھپانے لایق ہوتی ہیں۔
ثالث زمانی :۔ گویا نواب تو کوئی وو ہیں ——۔

(ہنستے ہیں)

کوچک سلطان : کھٹکا ہوا ہوں —— کبھی کوئی بات ہو جائے۔
ثالث زمانی : کاشفہ کا گانا۔
کاؤس شاہ : فرمایشی؟
ثالث زمانی : ہو سکتا ہے کیا کاشفہ بی؟
اُردابیگنی : ہو سکتا ہے سرکار، لیکن . . . .
ننھی بیگم و ثالث زمانی :۔ لیکن ویکن ہم نہیں جانتے۔
خواجہ قباد : نواب صاحب! —— بندی تعویذی پیش کرتی ہے۔
کاؤس شاہ : واللہ خوش کر دیا —— لاؤ تعویذی ——۔
ثالث زمانی : کیا گلوری ہے!
خواجہ قباد : نواب صاحب —— بندی لقمی پیش کرتی ہے۔
ننھی بیگم : لاؤ تو بی قباد ——۔
کوچک سلطان : اوہ قباد! (حیرانی چھپاتے ہوئے) تم ہو، قباد ——۔
گولنداروں کے ہاں منڈلانے والے ——!
خواجہ قباد : جی، میں ہی ہوں —— وہ قباد ——۔
کوچک سلطان : ہوں —— تو گویا تم زندہ ہو —— ! تمھارا گھاو ابھی

تک رِس رہا ہے (خوش ہوکر) لیکن ـــــ نہیں ـــــ تم زندہ نہیں ہو۔
واللہ کیا صورت نکالی ہے!

(ہنستا ہے)

آخر تم نے میرا کہنا مان ہی لیا کیا سعادت ہے!

خواجہ قباد :۔ ہاں نواب صاحب! مان لیا۔ ... لیکن ... لیکن ... آہ! ... لیجیے
ـــــ یہ سموسہ گلوری!

کوچک سلطان : شکریہ! تم کتنے اچھے دکھائی دیتے ہو قباد ـــــ میں نے کہا تھا
کہ اپنی شکست کا بدلہ لوں گا۔ سو میں نے لے لیا ہے۔

خواجہ قباد : اس کے لیے بھی بندی شکریہ ادا کرتی ہے ـــــ

کاؤس شاہ : ارے بابا، تم کن ذاتیات میں پڑ گئے ہو ؟

ثالث زمانی :۔ اب سنو گے بھی اپنی دلپسند چیز ـــــ ؟

کاؤس شاہ :۔ ارے بھائی وہ گاؤ ـــــ ۔

اے نمکپاش خدا کے لیے چٹکی نہ رکے
کوئی دم اور تڑپنے کا مزا رہنے دے

ثالث زمانی : ہاں ہاں ـــــ کچھ تو ہاتھوں میں مرے دُزدِ حنا رہنے دے ـــــ
اور اس کے متعلق کیا خیال ہے ؟ ـــــ علاج تشنگیم کے شوروِ آتشِ عشق

ننھی بیگم : یوں فیصلہ نہیں ہوسکے گا۔ اچھا ہے کاشفہ کو وہی چیز گانے کے لیے دی
جائے جو اُس نے اپنی مرضی سے تیار کی ہے۔

داروغنی :۔ (داخل ہوتے ہوئے) حضور، لیجیے نئی گلوری ـــــ

کاؤس شاہ :۔ تمباکو کافی ہے ـــــ داروغنی ـــــ

داروغنی :۔ سرکار! ـــــ

ثالث زمانی کاؤس شاہ : سازندے ہیں نا ـــــ ؟
داروغنی : یہیں دروازے کے پاس حکم کے منتظر کھڑے ہیں۔
کاؤس شاہ : بھیجو اندر اور سنو ـــــ دروازہ بند کردو۔
داروغنی : بہت اچھا سرکار۔ (جاتی ہے)
کوچک سلطان : (ہنستے ہوئے) خواجہ قباد ـــــ خواجہ قباد ـــــ۔
کاؤس شاہ : کاشفہ! اب کہو گی بھی کچھ ـــــ سازندے آگئے۔
اُردا بیگنی : جو ارشاد ـــــ (گاتی ہے)

ساقی نظرے بہ بیکساں بہرِ خدا
بشکن بُتِ بوالہوساں بہرِ خدا

(پہلے مصرع کی ادائیگی میں اتنی التجا ہے کہ کوچک سلطان اسے سن کر بے خود ہو جاتے ہیں، اور داد میں سر دھننے لگتے ہیں)

کوچک سلطان : واہ وا ـــــ حالت غیر کردی ـــــ کاشفہ ـــــ واہ ـــــ۔
اُردا بیگنی : (گاتے ہوئے)

ساقی نظرے بہ بیکساں بہرِ خدا
بشکن بُتِ بوالہوساں بہرِ خدا
ما ماہیِ مردہ ایم و لفِ آبِ حیات
مارا بوصالِ خود رساں بہرِ خدا

(کچھ دیر سب بے خود اضطراب رہتے ہیں ـــــ گویا گانے کی اس سے بڑی تعریف نہیں کر سکتے)

کوچک سلطان :۔ واہ وا ـــــ واہ ہی واہ ـــــ کیا میٹھا گانا تھا ـــــ سفر کی تکان جاتی رہی۔

کاؤس شاہ : خدا کی قسم! کیا گلا پایا ہے ____ اور بول کیا تھے، نشتر تھے۔
ننھی بیگم : نشتر؟ ____ اوہو! نشتر ہی تھے کہیں ۔ ۔ ۔ ۔
کاؤس شاہ : جانے ننھی بیگم خود بہت اچھا گاتی ہیں۔
ننھی بیگم : نہیں یہ تو نہیں لیکن نشتر ____
کاؤس شاہ : اماں چھوڑو اس کو اب ۔
ثالث زمانی : بھئی اب چلا جائے ____ کھانے میں دیر ہو رہی ہے ۔ دار وغنی کب سے منتظر ہے بیچاری۔
کاؤس شاہ : چلو چلیں ____ ۔
ننھی بیگم : ہاں بھئی، اب بہت دیر ہو گئی ____ اٹھو، لو کوچک میاں، یہ چہار شنبے کی انگوٹھی ہے۔ تم نہیں چلو گے کیا؟
کوچک سلطان : انگوٹھی کے لیے شکریہ آپا ____ اس پر کیا لکھا ہے ____ (بیر نگلہ دکھیانی سی ہنسی ہنستے ہوئے) اجی کہاں، آپا ____ میں اس خطاب کا سزاوار نہیں ہوں ____ اور ہاں میں کھانے پر بھی نہیں جا سکتا ذرا آرام کروں گا۔ کاشفہ مجھے کوئی ہلکا پھلکا گانا گا کر سلا دے گی۔ اور قباد بی قباد ____ تم بھی یہیں ٹھہرو۔

(باقی سب چلے جاتے ہیں)

کوچک سلطان : سناؤ بھائی قباد! اب تم بتاؤ شکست تمھاری ہوئی یا میری؟
خواجہ قباد : اے حضور، شکست ہمیشہ ہم غلاموں ہی کی ہوتی ہے۔
اُردا بیگنی : نواب صاحب! خدارا یوں بات نہ کیجیے۔ قباد آپ کی ہاں میں ہاں ملائے چلا جائے گا۔ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے۔ اور جو کچھ کہ وہ کہہ چکا ہے اس کی نوعیت قباد خود بھی سمجھنے سے قاصر ہے ۔

خواجہ قباد: اے ہے تم کیا کہہ رہی ہو کاشفہ! ــــــ جیسے میں بچہ ہی تو ہوتی ہوں۔
کوچک سلطان: (احساس فتحمندی سے) میں کاشفہ سے محبت کرتا تھا اور تم بھی کاشفہ سے محبت کرتے تھے۔ ہمارے دونوں کے درمیان ایک ہی بات مشترک تھی ــــــ اس لیے تمھیں اس بات کا فخر بھی حاصل ہو سکا کہ میرے ساتھ بات کر پاؤ ــــــ میں نے تمھاری حوصلہ افزائی کی ــــــ اور تمھیں کاشفہ کے قریب ہونے کا طریقہ بتا دیا۔ (ہنستا ہے)
ــــــ اب تم کاشفہ کے کس قدر قریب ہو گئے ہو ــــــ کس قدر قریب!
خواجہ قباد: کاش میں قریب نہ ہوتی ــــــ بالکل کاشفہ ہو جاتی لیکن ......
نواب کوچک: (قہقہہ لگاتا ہے) ہا ہا ہا ہا ــــــ۔
آرد ابیگنی: (بلند آواز سے) خاموش! نواب صاحب ــــــ آپ کو ندامت سے سر جھکا دینا چاہیے۔
(مرزا کوچک پر کنٹوری پھینکتی ہے جو فانوس سے بچتی ہوئی نیچے گر جاتی ہے)
نواب کوچک: اُف ــــــ لیکن بچ گیا۔ اتنی جرأت کاشفہ ــــــ بیس ہزار کا فانوس توڑنے لگی تھیں ــــــ۔
آرد ابیگنی: (غصے سے) اب قباد میں مرد کے حسد اور مرد کے انتقام کو کچل کر آپ قہقہے لگاتے ہیں۔ وہ دن یاد نہیں جب آپ کا عمامہ مبارک قباد کے ہاتھوں بدر رو میں لڑھک رہا تھا ــــــ آپ اسے ذلیل کرتے ہیں اب جیسے آپ نے مرد بھی نہیں رہنے دیا ــــــ اور جو نہ عورت ہے اکاش آپ کسی مرد سے ہی باتیں کرتے تو وہ اس بپھرے ہوئے شیر ببر کو رو، اودھ میں تبدیل کر دیتا۔ آپ کسی عورت سے باتیں کرتے تو وہ آپ

دوپٹہ اُڑھا کر وکٹری پہ بٹھا بھیجتی ———۔

مرزا ئے کوچک : (بلند آواز میں) کاشفہ ! کاشفہ ! تم ایک دو پیسے کی چھوکری ایسے مُنہ کو آتی ہو ———۔

اُردا بیگنی : معاف کیجیے ——— آپ کی طرح کسی بہن کی بدولت دوشالے نہیں پھڑکاتی پھرتی ——— اور جب ایک دو پیسے کی چھوکری کو مُنہ لگایا جاتا ہے تو وہ آپ کی والدہ مرحومہ سے بھی زیادہ ذی وجاہت ہو جاتی ہے۔

مرزائے کوچک : ہوں ! ——— میں اپنی دانست میں قباد کو مار چکا تھا لیکن اب دیکھتا ہوں قباد مرا نہیں ——— قباد اُردا بیگنی کے دل میں بدستور زندہ ہے۔

خواجہ قباد : (خواجہ سرایانہ انداز میں) اجی حضور ! خفا نہ ہو جیے ——— کیا کبھی بے لوث محبت بھی فنا ہوتی ہے۔

مرزائے کوچک : (دانت پیستے ہوئے) بے لوث محبت ! (بلند آواز سے ہنستا ہے) (طنزاً) اور کاشفہ کتنی حسرت کے ساتھ گاتی ہے۔

مارا بوصالِ خود رساں بہرِ خدا

اُردا بیگنی : (خجل ہو کر) اس کا یہ مطلب نہیں کہ . . . . . .

مرزائے کوچک : چند دن کی تیاریاں ——— اور اس کا یہ مطلب نہیں ! میں نے تمہارے دل کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھ لیا ہے کاشفہ ۔ اب تم مجھ سے نہیں چھپ سکتیں ۔ اگر ابھی تک قباد میرے راستے میں حائل ہے تو میں اسے جلا دوں گا راکھ کر دوں گا ———۔

(اٹھتا ہے اور تیزی سے قباد کو مارنے کے لیے دوڑتا ہے)

خواجہ قباد : اے خدا کے لیے مجھے بچاؤ ، کاشفہ بی ——— خدا کے لیے ——— رسولِ کریم کے لیے ۔

اُردا بیگنی : یہ خونی پنجہ مجھ پہ اُٹھے کوچک میاں ـــ پھر قباد کو ہاتھ لگانا ـــ میرے پیچھے
ہٹ جاؤ، قباد۔ تمھارا کوئی بال بیکا نہ کرسکے گا۔ پہلے میری آنتیں باہر آئیں گی،
میں دو نیم ہو جاؤں گی اور پھر مرزائے کوچک کی "ذوالفقار" تمھیں چھوئے گی۔

(قباد ہانپنے لگتا ہے اور رُاس کی "للہ للہ" کی آوازیں سنائی
دیتی ہیں ـــ شور سُن کر نواب ثالث زمانی بیگم داخل ہوتی ہے)

ثالث زمانی : کوچک میاں ـــ شیر بنگلہ! تمھیں عورت پہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے شرم
نہیں آتی ـــ ؟

کوچک سلطان : عورت نہیں آپا جان! یہ وہ مردود ہے جو عورت کی پناہ لے رہا ہے
ـــ قباد!

ثالث زمانی : یہ اور بھی باعث ننگ ہے۔ آج بنگلہ سے لوٹتے ہوئے تمھارا یہ
اقدام ہو کہ ایک خواجہ سرا پہ ہاتھ اٹھاؤ ـــ کیا یہ کوچک سلطان
کی شان کے شایاں ہے؟ چل اُٹھ، خاصے پر میرے ساتھ چل ـــ۔

(باہر نکل جاتے ہیں)

خواجہ قباد : کاشفہ! میں تمھارا کتنا ممنون ہوں ـــ کتنا مم.....

اُردا بیگنی : چل ہٹ میں تمھارا مُنہ دیکھنا نہیں چاہتی ـــ۔

خواجہ قباد : کاشفہ ـــ کیوں؟ تم نے اپنی زندگی کو جوکھم میں ڈال کر مجھے
بچایا ـــ اب میرا مُنہ دیکھنا نہیں چاہتیں ـــ کاشفہ ـــ!

اُردا بیگنی : چلی جاؤ ـــ جاؤ، بی قباد ـــ مجھے تم سے نفرت ہے ـــ

(پردہ)

تیسرا منظر

محلسرا کا ایک اور کمرہ، قریب قریب ایسا ہی جیسا دوسرے منظر میں نظر آتا ہے۔ ایک لونڈی گا رہی ہے۔

دل کہے ہے کہ مجھے روزنِ سینہ سے نکال — ورنہ خوں ہو کے ہیں آنکھوں سے نکل جاؤں گا
گر پڑا آگ میں پروانہ دمِ گرمیٔ شوق — سمجھا اتنا بھی نہ کمبخت کہ جل جاؤں گا

کاؤس شاہ: (دہراتے ہوئے) — سمجھا اتنا بھی نہ کمبخت کہ جل جاؤں گا — واہ!
ننھی بیگم: کیا خوب غزل ہے۔

(خواجہ قباد دوڑتا ہوا آتا ہے)

خواجہ قباد: بیگم — بیگم — اے قبلہ نواب صاحب —
ثالث زمانی: کیا ہے بی قباد؟
ننھی بیگم: کیا ہے بی قباد؟
کاؤس شاہ: اری کیا ہوا؟
خواجہ قباد: اجی سرکار! داروغنی سے پوچھیے — خیر صلا والی سے — آپ سے — بندی عرض کرتی ہے — ہائے آگ لگے ایسی جوانی کو، موئی جوانی —
نواب کاؤس شاہ: اری کچھ کہے گی بی؟
ننھی بیگم: کیا ہوا جوانی کو — جو اسے کوسنے دیے جا رہی ہو؟
خواجہ قباد: اے بیگم کیا بتاؤں — کاشفہ بی دروازے میں کھڑی تھی — کہہ رہی تھی — اب آپ سے کیا چھپاؤں — اب جبکہ کاشفہ بالکل مرنے

کے قریب ہے تو آپ کیا کہیں گے۔ اجی وہ کہہ رہی تھی قباد مجھے تم سے عشق ہے۔

کاؤس شاہ: تبھی تو مرنے چلی ہے ——۔

ثالث زمانی: خواجہ قباد سے محبّت ہے —— اُردابیگنی کاشفہ کو ——

(ہنستے ہیں)

کاؤس شاہ: کاشفہ کی سی پری کو دیو نژاد قباد سے محبّت ہے تو گویا یہ دیو پری کا قصّہ ہے۔

(ہنستے ہیں)

ثالث زمانی: اور درمیان میں آدم بُو ——۔

ننھی بیگم: جیسے عموماً مکھّی بنا کر دیوار پر چپکا دیا جاتا ہے۔

ثالث زمانی: بیگم، مکھّی نہیں ——۔

خواجہ قباد: (بدستور ہانپتے ہوئے) جی نہیں —— اُسے محبت ہے۔ بے لوث محبّت!

(سب ہنستے ہیں)

خواجہ قباد: عرض کیا حضور —— اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔ ہمیں بچپن ہی سے ایک دوسرے سے محبت ہے۔ ہم اڑبکوں کے احاطے میں اکٹھے کھیلے، اکٹھے پلے اور پل کر جوان ہوئے۔ ابھی کاشفہ پیدا بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ میری ہو چکی تھی

(سب مکرّر ہنستے ہیں)

نواب ثالث زمانی: بس ٹھیک ہے، اب تم قبر میں جاؤ تو پھر شادی ہو جائے گی۔

خواجہ قباد: اے سرکار! —— اجازت ہو تو کہوں —— کاشفہ کی ماں نے کہا تھا میری ماں سے —— اگر لڑکی پیدا ہوئی تو تمہارے قباد کو دے دوں گی اور اگر ہوا لڑکا تو پیر غضنفر کے مجاوروں کے حوالے کر دوں گی —— لیکن یہ قصّے لمبے ہیں، یہ باتیں پھر ہو جائیں گی —— حضور! کاشفہ سے باتیں کرتے ہوئے نواب کو چک کا ذکر آیا —— تو نہ جانے وہ کیا ہوا —— تھی

جو آتی ہے تو دھم سے نیچے آ رہتی ہیں۔

کاؤس شاہ: اوہو، تو شاہی طبیب کو کیوں نہیں بلایا؟

خواجہ قباد: عرض بندی کی یہ ہے کہ حکم نہ تھا سرکار کا۔

کاؤس شاہ: جاؤ، کاشفہ کو یہاں لے آؤ ـــــ اٹھا کر، بلدی سے ـــــ اور داروغنی یا باریدارنی جو کوئی بھی نظر پڑتی ہے اس سے کہو کہ شاہی طبیب کو بلا لائے۔ اب تو حکم ٹھیک سے ہے ـــــ؟

خواجہ قباد: جی، جی! ـــــ حضور، جاتی ہوں۔ خدا آپ کا اقبال بلند کرے، خدا آپ کے ...

(جاتا ہے)

کاؤس شاہ: یہ بات کیا ہوئی آخر؟

ننھی بیگم: آنکھوں سے دیکھے انسان تو صاف پتا چلتا ہے۔

ثالث زمانی: تو ہماری آنکھوں میں کیا جھٹا پڑ گیا ہے؟ ـــــ اور میری طرف کیوں دیکھتی ہو۔ ننھی بیگم ـــــ اس سے تو صاف کہہ دو تو اچھا ہے۔

کاؤس شاہ: ارے بھئی، آپس میں کیا رازداری ہے!

ننھی بیگم: میں کوئی دشمنی کی نہیں کہتی، بھلے کی ہی کہتی ہوں تاکہ معاملہ بہت دور جانے سے پہلے ہی تم لوگوں کے کان ہو جائیں ـــــ کوچک میاں کو ارد ابیگنی کاشفہ سے محبت ہے ـــــ۔

ثالث زمانی: دیکھو، الٹی بات تو نہ کرو ـــــ چاند پر مت تھوکو کہے دیتی ہوں کاشفہ کو کوچک میاں سے کوئی بات ہو گی، کوچک میاں کی پروا کرتی ہے بیزار۔

کاؤس شاہ: ہیں، ایک اردابیگنی کو اتنی جرأت کہ کوچک میاں سے آنکھیں لڑائے،

ننھی بیگم: چھنال! اور کٹنیوں کے ذریعے نامہ و پیام ہوتے ہیں۔ کاشفہ کی بوڑھی

ڈھڈو ماں کی پانچوں گھی میں رہی ہیں پچھلے دنوں ـــــ اسے بڑی فضیحتا ہے وہ دلالہ۔

کاؤس شاہ: (بلند آواز سے) بیگم! چراغ تلے اندھیرا۔ تم میں سے کسی نے بات بھی نہیں کی، سو رہی تھیں کیا ـــــ؟

ننھی بیگم: اے گویا آپ میری باتیں سنتے ہیں۔

کاؤس شاہ: کوچک میاں کے جنتے درست کر دیے ہوتے ـــــ

ننھی بیگم: وہ ثالث کے بھائی ہیں۔

کاؤس شاہ: (زیادہ خفا ہو کر) کاشفہ کو محل بدر کر دیا ہوتا ـــــ

ننھی بیگم: وہ کوچک میاں کی محبوبہ ہے۔

ثالث زمانی: پھر وہی بات ننھی بیگم ـــــ۔

(قدموں کی چاپ ـــــ کوچک میاں بھاگتے ہوئے داخل ہوتے ہیں)

مرزا کوچک سلطان: (ہانپتے ہوئے) کاؤس بھائی، کاؤس بھائی ـــــ میں آپ سے ایک بات کہنے آیا ہوں۔ گردن زدنی ٹھہراؤ یا کچھ اور ـــــ میں بلا تمہید کہتا ہوں، مجھے کاشفہ، اردا بیگنی سے محبت ہے ـــــ۔

ننھی بیگم: یہ رہا تمھارا چاند ـــــ ثالث زمانی بیگم!

ثالث زمانی: تو یہ نہیں ہو سکتا ـــــ کاشفہ نے کوئی تعویذ پلا دیا ہوگا۔

کاؤس شاہ: تمھیں کاشفہ سے محبت ہے؟

ثالث زمانی: تمھیں کاشفہ سے ـــــ۔

کوچک سلطان: محبت ہے!

کاؤس شاہ: (بلند آواز میں) کہیں تمھارا سر تو نہیں پھر گیا کوچک میاں؟

کوچک سلطان: (بدستور گھبرائے ہوئے) میں کیا کہہ رہا ہوں یہ میں خود بھی نہیں جانتا

اللہ اسے بچائیے ـــــ وہ تو لکھے کے قریب بیہوش پڑی ہے۔ اللہ....
(اس اثنا میں خواجہ قباد ہانپتا ہوا آتا ہے)
خواجہ قباد: یہ ہے کاشفہ! ـــــ اے حضور، اسے کسی طرح ہوش میں لائیے
ہائے میں لٹ گئی ـــــ
نواب ثالث زمانی: داروغنی۔
داروغنی: جی سرکار!
ثالث زمانی: جاؤ ذرا طاقچی پہ سے وہ مرادآبادی ڈبیا لے آ۔ اس میں لخلخہ ہے۔ بہن
ننھی ـــــ تو اٹھ ـــــ داروغنی کی بینائی کمزور ہے ذرا۔
(ننھی بیگم جاتی ہیں)
کاؤس شاہ: اس کے ہات اندر کو مڑے ہوئے ہیں۔
کوچک سلطان: (بدحواسی میں) دانت بھنچے ہوئے ہیں ـــــ
ثالث زمانی: آئے ہائے، کتنی گلفام تھی ـــــ اب منہ پر سیروں ہلدی بکھر رہی ہے
ننھی بیگم: (آتے ہوئے) اس کی ماں کو اطلاع دے دو۔ آئے ہائے! پھول ایسی بیٹی
ہاتھوں سے جا رہی ہے۔
کاؤس شاہ: ہاں ہاں داروغنی جاؤ ـــــ دیکھتی کیا ہو؟
داروغنی: جاتی ہوں سرکار!
خواجہ قباد: آئے ہائے ـــــ میری عمر بھر کی کمائی ـــــ۔
کوچک سلطان: جلدی کرو ـــــ جلدی کرو ـــــ کوئی نہیں آتا۔
ننھی بیگم: یہ لیجیے لخلخہ ـــــ اور بید مشک ـــــ اور نہ جانے کیا کیا ہے
اس میں۔ دیکھئے ثالث۔
ثالث زمانی: روئی کا ایک پھاہا چاہیے۔

کوچک سلطان : اس وقت رُوئی کہاں سے ملے گی؟ اس لحاف میں شگاف کر لیجیے
ننھی بیگم : کوچک بھائی! دیکھنا میرا ایرانی لحاف ہے!
کوچک سلطان : آپا! مجھ سے دوگنی، سہ گنی قیمت وصول کر لینا۔ کاشفہ بچ جائے کسی طرح ـــ کسی طرح ـــ۔
ننھی بیگم : قیمت کی کوئی بات نہیں کوچک میاں ـــ ایرانی لحاف روز روز تھوڑے ہی آتے ہیں ـــ
کوچک سلطان : اُف آپا! تمھیں لحاف کی پڑی ہے۔
ننھی بیگم : اوہو! یہ تو میں بھول ہی گئی تھی کہ اب کوچک میاں کی وجہ سے یہ اُردا بیگنی ایک بیگم کا مرتبہ رکھتی ہے ـــ کیوں نہ ہو، ایرانی نژاد خاتون ہے ـــ۔
کوچک سلطان : تم عورتوں کو اپنی جنس کے لیے ذرا بھی ہمدردی نہیں ہوتی ـــ آپا، معاف کیجیے گا، اگر آپ کو یہ الفاظ ناگوار گزریں تو ـــ
ننھی بیگم : کہہ دو ـــ کہہ دو ـــ ناگوار گزرتے ہیں تو تمھیں اس سے کیا۔ اپنی جنس کے لیے ہمدردی ہم نے تم ایسے مردوں کو سونپ رکھی ہے۔
کوچک سلطان : لِلّٰہ! طعنوں کے لیے کوئی اور موقع اُٹھا رکھنا ـــ تم بھی کنوئیں میں پڑے ہوئے عاجز پر بیٹھے پھبتیاں کسنے آ نکلیں ـــ۔
کاؤس شاہ : خاموش! ـــ کیا شور مچا رکھا ہے ـــ کاشفہ کو ہوش میں تو آنے دو۔ ہوا چھوڑ دو ـــ ہوا چھوڑ دو۔

(کاشفہ کی چیخ سُنائی دیتی ہے)

اُردا بیگنی : ہائے ہائے، میں کہاں ہوں ـــ ؟ قباد ـــ میرے قباد ـــ!
(اِدھر اُدھر دیکھ کر) بی قباد ـــ۔
ثالث زمانی : بات سیدھے ہو گئے ہیں ـــ۔

ننھی بیگم : دانت بھی کھل رہے ہیں ۔
ثالث زمانی : دیکھو، قباد کا ہی نام لیتی ہے ۔ بی قباد ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی ۔
قباد : پنکھا کہاں ہے ۔ اوہ ــــ جل تو جلال تو ــــ ۔
ننھی بیگم : رنگ آ رہا ہے مُنہ پر واپس ــــ ۔
ثالث زمانی : ہاں، آ تو رہا ہے ــــ ۔
اُردا بیگنی : چھوڑ دیجیے ــــ چھوڑ دیجیے ــــ ۔
داروغنی : حضور شاہی طبیب آئے ہیں ــــ پردے میں ہو جائیں ۔
کاؤس شاہ : تم سب پردے میں ہو جاؤ ــــ اور ہاں داروغنی، بابا طاہر کو فوراً اندر لے آؤ ۔

(بیگمات کے اِدھر اُدھر ہو جانے کے بعد شاہی طبیب آتے ہیں)

شاہی طبیب : حضورِ پُر نور ــــ رعایا آداب و تسلیمات عرض کرتی ہے ۔
مرزا کوچک : بابا طاہر، ایک لمحے کے لیے ان آداب و رسوم کو چھوڑ کر اس عورت کی جان بچایئے ــــ لِلّٰہ !
شاہی طبیب : کس کی جان بچاؤں ؟
مرزا کوچک : محل کی اُردا بیگنی کی ۔
شاہی طبیب : یہ لیجیے دھاگا ــــ ان کی نبض پر لپیٹ کر ایک سرا مجھے دید یجیے گا ۔
کاؤس شاہ : یہ لیجیے ــــ ۔

(کاشفہ کراہتی ہے)

شاہی طبیب : پہلے انھیں کیا شکایت ہوئی ؟
خواجہ سرا : کچھ بھی نہیں حکیم صاحب ! یوں ہی کھڑی کھڑی ایک دم نیچے آ رہیں اور ہاتھ پاؤں اندر کو مڑ گئے انیٹھن ہو گئیں۔ دانت بھنچ گئے ۔

اور منہ پر سیروں ہلدی بکھر گئی ۔

شاہی طبیب : ہوں ! (وقفہ) اب ان سے پوچھیے کیسا محسوس ہوتا ہے ؟

خواجہ سرا : کہہ رہی ہیں دشمنوں کا جسم پھٹا جاتا ہے ۔

شاہی طبیب : کچھ اور تکلیف ہے ؟

خواجہ سرا : کہہ رہی ہیں دشمنوں کے ہات پانو سوجے ہوئے محسوس ہوتے ہیں ۔
سب کچھ پھولا ہوا دکھائی دیتا ہے ـــــ اور اعضا تھکے ہوئے ہیں ۔
جی چاہتا ہے کہ ایک بازو کے دو بازو ہو جائیں ـــــ ایک منہ کے دو منہ
ـــــ اور نہ جانے کیا ہو رہا ہے ۔

شاہی طبیب : ان سے پوچھیے گا کہیں متلی تو نہیں محسوس ہوتی ؟

خواجہ سرا : اے ہے متلی کاہے کو محسوس ہونے لگی ـــــ کہہ رہی ہیں کہ نہیں !

شاہی طبیب : نواب صاحب ـــــ آپ ذرا ادھر تشریف لائیے ـــ میں تخلیہ
میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں ـــــ

نواب کاؤس شاہ : فرمایئے بابا طاہر ـــــ

شاہی طبیب : (آہستہ سے) جان کی امان پاؤں تو ایک سوال پوچھ سکتا ہوں؟
کیا انھیں کسی سے محبت تو نہیں ہے ؟

نواب کاؤس شاہ ۔ آ ۔ ۔ ۔ آ ۔ ۔ ۔ ۔ ں ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں تو ۔

شاہی طبیب : میرا مطلب ہے ـــــ محبت کا حیاتیاتی جذبہ اس عورت میں
شدت سے پیدا ہو چکا ہے ـــــ اس کی شادی کر دیجیے ۔

(پردہ)

چوتھا منظر

وہی جو دوسرے منظر میں ہے۔ نواب ثالث زمانی بیگم ایک گاؤتکیے پر بازو رکھے اپنا منہ چھپائے ہچکیاں لیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ قریب کوچک سلطان بیٹھے ہیں۔ ان کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، جیسے آپا جان کو منانے کی کوشش کر رہے ہوں۔

نواب ثالث زمانی: میں نے تو سب امیدیں تمھیں پر لگا رکھی تھیں کوچک میاں۔

کوچک سلطان: اور میں آپ کی کونسی امیدوں پر پورا نہیں اترا۔ بنگلہ میں نے تمھارے کہنے پر فتح کیا (آہستہ آواز میں) تخت و تاج تمھارے قبضے میں رکھنے کے لیے میں نے خواجہ سراؤں اور منصب داروں سے سازشیں کیں۔ تمھارے حقوق کو بچانے کے لیے میں نے تخت کے وارث کو گولکنڈہ کی طرف بھجوا دیا ہے۔ دکن ایک ایسی جنگی دلدل ہے جس میں پھنس کر کوئی مشکل ہی سے نکلتا ہے۔

نواب ثالث زمانی: یہ تو سب ٹھیک ہے کوچک میاں۔ لیکن اتنا وقار، اتنی وجاہت حاصل کرنے کا یہ عبرتناک انجام کہ تو شاہی خاندان سے باہر ایک آوارہ بیگی سے محبت کرے ——— شرافت محل کی قمر النسا میں کیا رکھا ہے ——— تم میری جگ ہنسائی کروا رہے ہو۔ اس دن جبکہ تم پر کاشغفہ سے محبت کا الزام لگ رہا تھا تو میں ننھی بیگم سے کہہ رہی تھی کہ تم چاند پر تھوک رہی ہو۔۔۔۔۔

کوچک سلطان: (التجا آمیز لہجے میں) یہ ایک ایسی بات ہے جس میں، میں بالکل بے،

بے دست و پا ہوں ہیں ہفت اقلیم کی بادشاہت حاصل کر سکتا ہوں۔ لیکن کاشفہ کی محبت کو نہیں چھوڑ سکتا ..... میں خود نہیں جانتا، آپا، مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میرے جسم کا رُواں رُواں اس اتصال کا قایل ہے۔ آپا!

نواب ثالث زمانی : اور پھر سوچو تو سہی کہ کاشفہ کو کسی زمانے میں قباد سے محبت تھی۔

کوچک سلطان : اس قصرِ محبّت کے ستون عرصہ ہوا منہدم ہو چکے ہیں۔

ثالث زمانی : خواجہ قباد نے کاشفہ کے لیے جو قربانی کی ہے اس کا جواب وہ قربانی سے دینا چاہتی ہے۔

کوچک سلطان : مجھ سے یہ بات نہ کہو، آپا! —— لِلّٰہ مجھے ایک اُردا بیگنی سے محبت کرنے پر ملامت نہ کرو۔ عشق اگرچہ بلاست آں بہ حکم خداست۔ بر حکم خدا ملامتِ خلق چراست؟

ثالث زمانی : ان سب باتوں کو میں اچھی طرح جانتی ہوں، کوچک میاں! کاشفہ خواجہ سرا قباد اور تم سے بیک وقت محبّت بھی کرتی ہے اور نفرت بھی۔ خواجہ سرا قباد کی قربانی کی وہ معترف ہے لیکن قباد کاشفہ کی محبت کا اہل نہیں —— تم اس کی محبّت کے اہل ہو لیکن خواجہ قباد کے ساتھ جو کچھ تم نے کیا ہے وہ کاشفہ کے دل سے دھوئے نہیں دُھلے گا۔

کوچک مرزا : یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو آپا —— مجھے اس بات کا ثبوت دو۔ مجھ میں اصل کوچک مرزا بیدار ہو رہا ہے، مجھے جلد ہی بتا دو نہیں تو میرے غصّے کی آگ میں یہ محل، یہ خواجہ سرا، یہ کاؤس شاہ اور بلند بخت یہ شرافت محل اور ننھی بیگم۔ یہ اُردا بیگنی سب جل جائیں گے۔

ثالث زمانی : لو سنو، جس دن تم قباد کو تحت الثریٰ پہنچانے کے لیے تیار ہو رہے تھے تو

کاشفہ نے قباد سے محبت کی پاسداری کی اور اپنی اوٹ دے کر اُسے بچا لیا، اور جب اُس نے قربانی کا شکریہ ادا کیا تو اُس نے نفرت سے کہا ــــ پیچھے ہٹ جاؤ قباد! مجھے تم سے نفرت ہے۔

کوچک مرزا: گویا قباد کی جان بچا کر کاشفہ، اس کی قربانی کا جواب قربانی سے دے چکی ہے۔

ثالث زمانی: ہرگز نہیں ــــ وہ جانتی ہے کہ اگر قباد مرد ہوتا تو اس کے پیچھے نہ چھپتا وہ تمہاری شجاعت کی معترف ہوتے ہوئے تم سے نفرت کرتی ہے کہ تم نے قباد میں مرد کو فنا کرتے ہوئے اپنی کم ظرفی کا ثبوت دیا ہے۔ اور اگر قباد اس قسم کی حرکتیں کرتا ہے تو یہ اس کے بس کا روگ نہیں۔ بیماری کے دنوں میں قباد نے اس کی بہت خدمت کی لیکن اس کی موتیوں کی مالا ٹھکرا کر کاشفہ نے تمہاری مونگے کی مالا پہن لی اور تم خوش ہوئے ــــ لیکن جب تصفیہ کا موقع آیا تو اُس نے تمہیں ہاتھ دینے سے انکار کر دیا ــــ یہ سب کچھ میں جھروکے میں سے دیکھ رہی تھی۔

کوچک مرزا: کیا عجیب ہے آپا ــــ وہ ابھی تک ڈرتی ہو ــــ آپا ــــ اچھی آپا ــــ اس طلسم کو بنا رہنے دو ــــ میں اپنے سامری کے اور ہاتھ دیکھنا چاہتا ہوں ــــ میں اتنی حقیقت جاننا نہیں چاہتا۔

(محل میں شور سنائی دیتا ہے اور دارو غنی آتی ہے)

داروغنی: نواب صاحبہ ــــ نواب صاحبہ!

نواب ثالث زمانی: کیا بات ہے داروغنی بی؟

داروغنی: محل میں لامیہ سلطان قمر النسا اور شرافت محل کی ڈولیاں آ رہی ہیں، اور آرد ابیگنی محل میں نہیں ہے۔

کوچک مرزا: (چلا کر) کاشفہ تنقیح کے لیے نہیں ہے؟

داروغنی: جی نہیں ہے ——۔

نواب ثالث زمانی: داروغنی —— کسی باریدارنی کو پکڑلو اور اسے کیانی اچکن اور انگرکھا پہنا دو۔

داروغنی: لیکن ——؟

نواب ثالث زمانی: لیکن کیا؟

داروغنی: اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں؟

کوچک سلطان و نواب ثالث زمانی: کہو جلدی کہو۔

داروغنی: نواب صاحب پچاس سال سے ہم نے اس گھر کا نمک کھایا ہے اور اس کے بہی خواہ ہیں۔ اس خاندان ذی مرتبت کی خاطر میری دادی نے اپنی جان تک قربان کر دی تھی اور میں بھی اگر ضرورت پڑے، تو جان تک دینے کو تیار ہوں —— بات یہ ہے کہ اس معاشقے کی بدولت محلوں کی بدنامی ہو رہی ہے۔ شہر میں لوگ چہ میگوئیاں کر رہے ہیں۔

نواب ثالث زمانی: (غصے سے) تمہیں اس سے غرض ——؟ ہماری آنکھیں نہیں کیا؟ مت منہ لگو ایسے —— جاؤ کسی باریدارنی سے تنقیح کروالو۔

داروغنی: جو حکم حضور! (جاتی ہے)

نواب ثالث زمانی: (روتے ہوئے) تم نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا کوچک میاں۔

کوچک سلطان: کاشفہ چلی گئی —— کاشفہ نے خودکشی کر لی۔ یہ نہیں ہو سکتا —— یہ نہیں ہو سکتا —— میری کاشفہ —— اگر کاشفہ مر گئی تو اس کا خون تم لوگوں کی گردن پہ ہو گا۔

(نواب ننھی بیگم داخل ہوتی ہیں)

کوچک سلطان: آپا چلی جاؤ ـــ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ رستے زخموں پر زیادہ نمک نہ چھڑکو۔ میں کاشفہ کو سمندر کی تہ سے لاؤں گا، پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے تلاش کر لوں گا۔

ننھی بیگم: سمندر کی تہوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر جانے کی ضرورت ہی کیا ہے ـــ کاشفہ شہر میں خلجی سردار کے ہاں دیکھی گئی ہے۔

کوچک سلطان: (چونک کر) کون خلجی سردار؟

ننھی بیگم: قویش ـــ وہ سردار قویش کے ساتھ چلی گئی ہے۔ باریدارنیوں نے اُسے سردار کے ساتھ دیکھا تھا۔

کوچک سلطان: کاشفہ وہاں کیسے پہنچ گئی؟

ننھی بیگم: پہنچ گئی ـــ محل کی عزّت و افتخار کو لات مار گئی۔ ایسے میں محلوں کی دیواریں راہ میں حائل نہیں ہو سکتیں۔ اس نے سردار قویش کو صرف ایک دو بار دیکھا اور معاً اس کے دماغ نے فیصلہ کر لیا کہ اس کے مقدر میں جو بچّہ لکھا ہے قویش سردار اس کا باپ ہوگا۔

کوچک سلطان: آپا ـــ آپا جان ـــ یہ نہیں ہونے کا ـــ جب تک مرزا کوچک سلطان زندہ ہے۔

ثالث زمانی: دیکھا اپنی محبت کا عبرتناک انجام؟ کہاں جاتے ہو کوچک؟ ـــ رُک جاؤ قویش سردار تم سے کہیں طاقت ور ہے، کوچک تھم جاؤ۔

(ثالث زمانی اور ننھی بیگم کوچک میاں کو پکڑنے کی کوشش کرتی ہیں)

ننھی بیگم: وہاں مت جاؤ ـــ کوچک بھائی ـــ مت جاؤ، خدا کے لیے۔

کوچک سلطان: کوچک سلطان ایسی بات کی تاب نہیں لا سکتا۔ کوئی بھی مرد ایسی بات برداشت نہیں کر سکتا۔ آپا جان، مجھے چھوڑ دو ـــ چھوڑ دو ـــ مر جاؤں گا، زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا ـــ مجھے جانے دو ـــ جانے دو۔

(بہت شور بپا ہوتا ہے۔ دروازے کھلتے اور بند ہوتے ہیں اور مرزا کوچک

بھاگ جاتے ہیں)

ثالث زمانی: بھاگ گیا ——— آہ، ننھی بہن۔ تو نے نہ بتایا ہوتا۔ تو کوچک کو نہیں جانتی کیا؟ ۔ نہیں جانتی تھی کیا ——— اب انہیں خبر کردو جلدی سے نہیں تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ننھی بیگم: میں تو اس ارادے سے آئی تھی کہ کاشفہ کی بے وفائی کے متعلق سُن کر کوچک سلطان اپنے ارادے کو ترک کردے اور محلوں کے متعلق جو چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں وہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں۔

ثالث زمانی: تم نے مجھ سے دشمنی کی ہے، ننھی بیگم ——— ہائے کوچک!

ننھی بیگم: قباد! ——— اری قبادی!!

(قباد داخل ہوتا ہے)

قباد: بیگم، کیا حکم ہے؟

ننھی بیگم: اری جا ——— بھاگ جا اور انھیں خبر کردے کہ مرزا کوچک سردار قویش سے لڑنے کے لیے تنِ تنہا بھاگ نکلے ہیں۔

ثالث زمانی: ہاں ہاں ——— جا جلدی ذرا ——— سُن!

قباد: حکم سرکار!

ثالث زمانی: تمہیں جانتی بی قباد۔ تیری کاشفہ اُردا بیگنی سردار قویش کے ساتھ چلی گئی ہے۔

قباد: سرکار۔ میں نے بھی آدمی چھوڑے ہوئے ہیں۔ رتی رتی کی خبر پہنچتی ہے مجھے۔

ثالث زمانی: اور تو ابھی تک یہیں ہے ——— قباد!

قباد: (مکمل خواجہ سرایانہ انداز میں) آئے ہائے بیگم ——— قربان جاؤں ——— اتنی سی بات کے پیچھے اب مر تھوڑے ہی جائے ہے آدمی ——— جینا بھی تو مقدم ہے ———!!

(پردہ)

چانکیہ

چندرگپت موریہ : بھارت سمراٹ
چانکیہ : مہامنتری
دُردھر : چندرگپت کی رانی
پروتک : ایک ساتھی راجا
انوّرادھا : وش کنّیا
راج دوت ، انگ رکھشکائیں، پنڈت اور دوسرے لوگ
وقت : موریہ خاندان کا عروج

⁂ ⁂ ⁂

پہلا منظر

رات کا پچھلا پہر۔ مہاراج چندر گپت رنواس میں سوئے پڑے ہیں۔ ان کی شیّا پر دونوں طرف انگ رکھشکائیں کھڑی ہیں۔ ایک سندری ستار لے کر آتی ہے اور بہت مدھم سروں میں ساز چھیڑتی ہے معلوم ہوتا ہے کہیں دور سے آواز آ رہی ہے ______

جاگو، جاگو راج نریش
تم جاگو دنیا سوئے

مہاراج آہستہ آہستہ اُٹھتے ہیں اور پھر لیٹ جاتے ہیں وہ ابھی اور سونا چاہتے ہیں۔ اُن کے پہلو میں پڑی ہوئی مہارانی دُردھر بھی آنکھیں کھول دیتی ہیں۔ مہاراج جماہی لیتے ہوئے کھڑکی سے باہر چاندنی میں نہاتے ہوئے شہر پاٹلی پُتر کی طرف دیکھتے ہیں ______

چندر گپت : ابھی کتنی ہی رات باقی ہے۔ دُردھر ______ میری رانی اور پاٹلی پُتر ــــ میری راجدھانی دونوں کیسے شانت مئی نِدرا میں کھوئے پڑے ہیں اور اپنے سپنوں میں اور بھی سندر ہو گئے ہیں ...... لیکن ..... (فیصلہ کُن انداز میں) یہ راج سمراٹ کا کرم نہیں کہ وہ تین گھڑی سے زیادہ سوئے

دُردھر : (جاگتے ہوئے) مہاراج !

چندر گپت : مہارانی، جاگ گئیں ؟

دُردھر : مہاراج ! آپ کدھر جا رہے ہیں ؟ (جماہی لیتی ہیں)

چندر گپت : (بیزاری سے) دن بھر کی محنت کے لیے (ہلکی سی ہنسی ہنس کر)
سمراٹ چندر گپت کو لوگ جانے کتنا سکھی سمجھتے ہیں۔
دُردھر : ابھی بہت رات باقی ہے پر یہ —— پڑے رہیے چپکے سے۔
چندر گپت : سنہری تیتر سکار گار میں پھڑپھڑانے لگے ہیں۔ تال کے کنارے سوئے
ہوئے سوروں نے بھی اپنی چونچیں پروں سے نکال لی ہیں —— اور تم
مجھے پڑا رہنے کے لیے کہہ رہی ہو، دُردھر . . . . دُردھر! کتنا انشچت ہے
تمھارا پریم! جیسے سوتے میں ششو اپنا ہاتھ جننی پر رکھ دیتا ہے اور اسے
ذرا بھی ہلنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اسی طرح تم بھی اپنا ——
دردھر : ہاں مہاراج! اس کو بھی میری طرح پریم کے چور کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ اس
بات کے گیان کو من میں بسائے کہ پتا پتر اور ماتا کے پریم میں بادھک ہے،
وہ آنند کا کا ہاتھ اپنی ماں پر رکھ دیتا ہے۔
چندر گپت : (فتح مندی کے احساس سے) اوہ! دُردھر کی سی سندری کو بھی
اپنی وجے میں سندیہ ہے۔
دُردھر : (سرد آہ بھرتے ہوئے) میری سندرتا وہ تھامنے والا ہات نہ ہوئی۔ آہ!
اس بات کا آپ کی دُردھر کو شوک ہے۔
چندر گپت : دُردھرے! کہو، تم اپنے پریم کا چور کسے سمجھتی ہو؟
دُردھر : یہ میں خود بھی نہیں جانتی پریہ ور۔ شاید جاننا بھی نہیں چاہتی۔ اس
پنچھی کی نائیں کی جو گھات کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتا ہے . . . بس اس
بھرم میں خوش ہوں کہ آپ مجھے جی سے چاہتے ہیں۔
چندر گپت : شاید تمھارا اشارا انوراڈھا کی طرف ہے۔ لیکن تم نہیں جانتیں کہ
میں نیتی میں پریم کو کچھ نہیں سمجھتا۔

دُردھر: یہی سمراٹ کے لیے ہے۔ منتشیہ کے لیے نہیں اور منتشیہ کے لیے پریم ہی سبھی کچھ ہے۔

چندرگپت: چندرگپت سمراٹ ہی تو ہے۔

دُردھر: راتو اس سے پرے ——— سنگھاسن آپ سے بہت دُور ہے۔ اور تاج دوار سے باہر ایک انگ رکھشک تھامے کھڑی ہے۔ اس وقت شیّا پر آپ کے چرن ہیں اور اُن پر دُردھر کا سیس۔

چندرگپت: جس سمراٹ نے اپنے آپ کو بھاوناؤں میں کھویا، اس نے اپنے پاؤں پر آپ پرشا چلایا۔ دُردھرے! مجھے ان سونے کی زنجیروں سے نکلنے دو۔

دُردھر: (تراش ہو کر اور غصے میں) چانکیہ کے ششش سے اور کسی کو کیا آشا ہو سکتی ہے؟ لیکن چانکیہ نے جیون بھر پریم نہیں کیا۔ نند سے بدلہ لینے کے لیے اس نے کرودھ سے نہ صرف اپنی چٹیا کھولے رکھی بلکہ اس اگنی میں اپنے آپ کو بھی بھسم کر ڈالا، اب وہ راکھ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ... کچھ بھی نہیں۔ ... کچھ بھی نہیں ——— جس طرح وش کنیا کے شریر میں وِش دھیرے دھیرے بس جاتی ہے۔ اس طرح کرودھ اور بدلے کی آگ اُس کی نس نس میں سلگ رہی ہے، وہ تکشک ناگ کی طرح کالا بھجنگ ہے وش کنیا سمان وہ جسے بھی چھوئے گا جلا ڈالے گا۔

چندرگپت: تم یہ سب باتیں اُسے بتا رہی ہو جس نے اس کے ساتھ برسوں تپسیا کی اور جس کی سنگت سے چندرگپت نے پاٹلی پتر کا راج پراپت کیا ——— چھوڑو مجھے آج بیلوں کی دوڑ ہے اور میں اپنے مہانندی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔

دُردھر: چانکیہ نے منتشیہ کی سروچ آدرشتا سے گرا کر آپ کو صرف ایک سمراٹ بنا دیا، اس کُٹل کٹھور براہمن کا ارتھ شاستر تمام گھڑنا اور ستیہ سے

بھرا پڑا ہے۔ پریم سے نہیں۔ اَپرادھی کو چھما کر دینے میں جو آنند ہے اُس کی پراپتی اس نے کبھی نہیں کی۔ پریم کے پرم آنند کا اُسے کوئی انوبھو نہیں۔ آپ نے تو جیون میں پریم رس چکھا ہے۔ آپ کے مُنہ کو ایسی باتیں شوبھا نہیں دیتیں۔

چندر گپت: چانکیہ کا درشن ایک مہان پنڈت کا تتو گیان ہے۔ جیسے ۲ دو اور ۲ دو چار ہوتے ہیں اور ہمیشہ ہوں گے، اس طرح چانکیہ کا گیان بھی اٹل رہے گا۔ جن لوگوں کو میں نے چھما کر دینے کا (طنزاً) پرم آنند حاصل کرنے کے لیے چھوڑا انھوں نے ہی میری جڑیں کاٹیں ——— چانکیہ کے سدھانت اپواد نہیں جانتے ———

دُردھر: (طنزاً) اپواد نہیں جانتے ہ——— جس سمے آپ نے کرودھ وش چانکیہ کو راج دربار سے الگ کیا تو اسے موت کی سزا کیوں نہ دی؟

چندر گپت: اس لیے کہ وہ براہمن ہے۔ چانکیہ کی مہانتا کا تم اس بات سے اندازہ لگا سکتی ہو کہ راج دربار میں پھر سے مان پاتے ہوئے اس نے میری اس بھول کو جتا دیا تھا۔

دُردھر: میں اسے بھول نہیں کہتی۔ اگر آپ نے اُسے مرتیو ڈنڈ دیا ہوتا تو پاٹلی پتر تو ابھی آپ کے وِردھ اُٹھ کھڑے ہوتے۔ براہمن کا گھات کون سہن کر سکتا ہے۔ اور اگر آپ چانکیہ کے سچے شِشّ ہیں تو آپ کو بھی اُسے مار دینا چاہیے نہ جانے وہ کب وشواس گھات کرے۔

(وقفہ)

"راج سمراٹ کا کرم نہیں کہ وہ تین گھڑی سے زیادہ سوئے" ——— یہ بھی چانکیہ کے ارتھ شاستر میں لکھا ہوگا۔

چندرگپت : مجھے اس بات کے مان جانے ہیں کوئی لجا نہیں مہارانی ـــــ چانکیہ ٹھیک ہی کہتا ہے ۔ مجھے گوادھیاکش کے پاس اپنے مہانندی کو دیکھنے جانے دو ۔ آج وہ پروتک کے بیل کو ہرا دے گا ـــــ مجھے جانے دو ، نیتی ہیں پریم بھاد ایک کمزوری ہے ۔

دُردھر : پریم ، جس پر سوراج پاٹ کا بلیدان دیا جا سکتا ہے ـــــ مہاراج ! آپ بھی تو وچار یئے ۔ آخر آپ چانکیہ سے اتنے ڈرتے کیوں ہیں ؟ پاٹلی پتر کے مانسرووراییسے تال ، ان کے اندر ڈبکیاں لگانے والی مچھلیاں ، ان کے کنارے ناچنے والے مور ، ہاتھی دانت کے ستون ، یہ دوڑنے والے بیل ، ہاتھی ، گینڈے ، یہ وشال دیش کس کا ہے ؟

چندرگپت : جس طرح یہ محل اور ان کے اونچے اونچے سنہری کلس کلاکاروں کے ہاتھوں سے بن کر سماپت ہوئے لیکن ان کا سوامی چندرگپت ہے ، اسی طرح نیم اور نیتی کے ستونوں کا رچیتا مہامنتری چانکیہ ہے لیکن ان کو لاگو کرنے والا پالن کرنے والا میں ہوں ۔ پریشد اور اٹھارہ اماتیہ بنائے ہوئے چانکیہ کے ہیں لیکن وہ وہاں میری اچھا انوسار ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نوادھیاکش ، گوادھیاکش ، ہست ، اسو ، رتھ ادھیاکش سب سمراٹ چندرگپت کے اشارے پر ناچتے ہیں ۔

دُردھر : یہ میں مانتی ہوں پاٹلی پتر کا تاج مہاراج چندرگپت کے سر پر ہے ، چانکیہ کے سر پر نہیں ، لیکن آپ بھوجن تک وہی کرتے ہیں جو چانکیہ نشچت کرتا ہے ۔ وہی وستر پہنتے ہیں جنھیں پہننے کے لیے چانکیہ کہتا ہے ـــــ اسی استری سے پریم کرتے ہیں جس کے ساتھ پریم کرنے کی چانکیہ پریرنا کرتا ہے ـــــ دوسرے شبدوں میں پریم کی بھیک مانگنے کے لیے مجھے اپنا آنچل مہاراج چندرگپت کے سامنے نہیں ، چانکیہ

کے سامنے پھیلانا چاہیے۔

(گلا رُندھ جاتا ہے)

نہیں نہیں میں اپنا آنچل اس کالے بھجنگ براہمن کے آگے کبھی نہ پھیلاؤں گی ——— میں پریم کے بندھن آپ کے پاؤں میں ڈال دوں گی۔ آنسوؤں کے ساگر آپ اور آپ کی نیتی کے درمیان بادھک بنا کر پھیلا دوں گی ———

چندر گپت: یوں پگلی نہ بنو، دُردھر! . . . . . ارتھ شاستر نے مجھے آنسوؤں کے ساگر کو پاٹنا سکھا دیا ہے. . . . اچھا، میں چلتا ہوں . . . . .

(مہاراج دائیں طرف جاتے ہیں۔ دُردھر شیّا پر اپنا مُنہ چھپائے سسکیاں لے رہی ہے جبکہ پردہ گر جاتا ہے)

دوسرا منظر

رنگ بھومی کا وشرانتی استھان۔ سامنے کا دروازہ رنگ بھومی
میں کھلتا ہے جہاں گویا دھیاکش رتھوں کی دوڑ کروا رہے ہیں۔
دروازے سے لوگوں کی آوازیں آتی ہیں جو کبھی مدھم اور کبھی اونچی ہو جاتی
ہیں۔ کبھی کبھی راج دوت کسی راجے یا راجکمار کے آنے کی خبر دیتا ہے۔
شور میں رتھوں کے دوڑنے کی آواز بھی شامل ہے۔ ایکا ایکی لوگ
یوں بول اٹھتے ہیں جیسے کسی جیتنے ہوئے رتھبان کا جے جے کار کر رہے
ہوں۔

(گھنٹے کی آواز)

دُوت: راج راجیشور راجکرورتی سمراٹ شریمان مہاراج چندرگپت
اور مہارانی دُردھر رنگ بھومی میں پدھارتے ہیں۔

(شور)

(گھنٹے کی آواز)

دُوت: راج راجیشور شریمان مہاراج پرورتک اور کماری انورادھا

(زیادہ شور)

(گھنٹے کی آواز)

دُوت: راجکمار بندوسار، راجکمار ملیہ کیتو

(شور)

(گھنٹے کی آواز)

دوت : مہا منتری چانکیہ۔

(بہت زیادہ شور)

اس عرصے میں وشرانتی استھان میں انگ رکھشکائیں ڈری سہمی کھڑی رہتی ہیں۔ کبھی کبھی ایک دوسری کو اشارا کرلیتی ہیں کچھ دیر بعد وہی شور پھر سُنائی دیتا ہے اور رتھوں کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ اور بھی اونچی ہوجاتی ہے۔

ایک پل بعد چانکیہ وشرانتی استھان میں سامنے کے دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔ دُبلے پتلے اور لمبے انسان ہیں۔ رنگ کالا، گال اندر کو پچکے ہوئے ہیں، آنکھوں میں شک اور تجسّس کی جھلک ہے۔ ایک ہاتھ سے اپنی ٹھوڑی کھُجاتے ہیں، اور دوسرے ہاتھ کے انگوٹھے کو اضطراب کے عالم میں جنیو پر پھیرتے ہیں۔ پھر دونوں ہاتھوں سے سر پر کی لمبی چُٹیا کو گانٹھ دیتے ہیں اور دروازے کی طرف جھانکتے ہیں۔ انگ رکھشکاؤں کے پران خشک نظر آتے ہیں . . . .

تھوڑی دیر بعد مہاراج چندرگپت وشرانتی استھان کے سامنے دروازے میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ابھی تک رنگ بھومی میں بیٹھی ہوئی دُردھرسے باتیں کر رہے ہیں . . .

چندرگپت : (طفلانہ انداز میں) دونوں دُھول میں غائب ہیں لے۔ رتھ اور مہانندی! دردھرے، کیا تمھیں نظر آرہا ہے ؟

چانکیہ : مہاراج ! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔

چندرگپت : کیا کوئی بہت ضروری بات ہے مہامنتری جانکیہ ؟ اس سمے میرا مہانندی رنگ بھومی میں ہے ــــ وہ دوڑ رہا ہے ــــ وہ دیکھو دونوں دھول

میں غائب ہیں۔

چانکیہ: مہاراج مجھے سمے کے انوسار کچھ پرارتھنا کرنی ہے۔ کچھ دیر کے لیے ادھر وشرانتی استھان میں آئیے —— ہاں، مہاراج!

(مہاراج اندر آتے ہیں)

چندر گپت: آج موسم بھی تو کتنا خراب ہے مہامنتری! سوریہ اپنا سارا تیج پاٹلی پتر پر ہی ختم کر دے گا کیا؟

چانکیہ: یہ پرماتما کی دیا اور ورشا کا انومان ہے۔

چندر گپت: استھان کے کواڑ بند کر لو۔ انگ رکشکا! خیال رکھنا کوئی ادھر نہ آنے پائے ——

چانکیہ: اس کی دیکھ بھال میں نے پہلے ہی کر لی ہے، مہاراج! میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کے مہانندی کو آج وجے پراپت نہیں ہوگی۔

چندر گپت: مہانندی کو وجے پراپت نہیں ہوگی؟ —— میرا مہانندی اوشیہ وجی ہوگا! پروتک کا بیل پہلے ہی چکر میں بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ یہ جیوتش ودیا تم نے کب سیکھی؟

چانکیہ: یہ جیوتش نہیں مہاراج! میں یہ سب کچھ اسی بدھی کے بل بوتے پہ کہہ رہا ہوں جو میں نے اتنی تپسیا کے بعد پراپت کی ہے۔

چندر گپت: اگر مہانندی رنگ بھومی میں ہار بھی جائے تو کیا ہے۔ مجھے ایک اچھے کھلاڑی کی طرح پروتک کو بدھائی دینی چاہیے۔

چانکیہ: (زور سے) یہ اسمبھو ہے —— یہ نہیں ہوگا، پاٹلی پتر کے مہاراج کو لوگوں کے من کا دیوتا ہونا چاہیے۔ یہ اس کے لیے ایسے ہی ضروری ہے جیسے جیون کے لیے سانس لینا۔ دنیا جیتنے والے کا ساتھ دیتی ہے، ہارنے والے کا

نہیں۔

چندرگپت: مہامنتری، ہمیں رنگ بھومی کی وجے اور پاٹلی پتر کی وجے دونوں کو گھال میل نہیں کرنا چاہیے۔

چانکیہ: مہاراج! پاٹلی پتر نواسیوں نے آپ کے آنے پر اتنا شور نہیں مچایا جتنا پروتک کے آنے پر۔ اس بات پر میرا ماتھا ٹھنکتا ہے۔

چندرگپت: (ہنس کر) لوگ استھر اور من موجی ہوتے ہیں۔

چانکیہ: (کرودھ سے) مہاراج! آپ نہیں جانتے کہ رنگ بھومی کی وجے پاٹلی پتر کی وجے سے کہیں زیادہ ضروری ہے... میں اس وقت آپ کو بُری خبر سنانے آیا ہوں۔

چندرگپت: بُری خبر! ___ میں اس کے لیے تیار ہوں۔ ٹھہرو، مجھے چبوترے سے ایک دفعہ مہانندی کو دیکھ لینے دو۔

(چندرگپت کے قدموں کی آواز کے ساتھ ہی یک لخت شور سنائی دیتا ہے جیسے انھوں نے کمرے کے بند کواڑ آناً فاناً کھول دیے ہوں ___ شور مدھم ہو جاتا ہے، گویا مہاراج واپس آئے ہیں)

چندرگپت: دوسرے چکر میں بھی مہانندی آگے ہے اور پروتک کے رتھ کا نشان تک نہیں ملتا۔ ہا ہا ہا ___ !!!

چانکیہ: یہ پرسنتا کا کارن ہے مہاراج! ابھی چھ چکر باقی ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں آپ میرے کتھن کی ستیتا کو جان لیں گے... میں دراصل آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مہاراج پروتک کے کانٹے کو ہمیں ہمیشہ کے لیے دور کر دینا ہوگا۔

چندرگپت: (زمین پر پاؤں مار کر) کیا مطلب ہے تمھارا؟ سب کچھ [illegible] ہوگا مہامنتری لیکن پروتک کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ اس سے پہلے [illegible] آتے ہیں

موندکر تمھاری سب باتیں مانی ہیں لیکن اب میں تمھارے ہاتھوں کٹ پتلی بننا نہیں چاہتا ـــــــ میرے کچھ پرشنوں کا اُتّر دو ــــ یہ رنگ بھومی، یہ سنہری ستون اور اس کے کلس کس نے بنائے ہیں ؟

چانکیہ : کلاکاروں نے۔

چندرگپت : لیکن ان کا سوامی کون ہے ؟

چانکیہ : مہاراج چندرگپت۔

چندرگپت : اس نیم اور نیتی کا رچیتا کون ہے ؟

چانکیہ : داس ــــــ منتری چانکیہ۔

چندرگپت : ان کا لاگو کرنے والا پانہ کرنے والا کون ہے ؟ پریشد، اماتیہ دیہوہارک سمہرت کس کے اشارے پر چلتے ہیں ؟

چانکیہ : نیتی کے لاگو کرنے والے آپ ہیں۔ سب دیہوہارک آپ کے اشارے پر چلتے ہیں۔ لیکن ان کے بیوہار کے ارتھ جانے بنا آپ ایک پگ بھی نہیں چل سکتے۔ اور ان کے ارتھ جاننے کے لیے داس کو مہامنتری بنایا گیا ہے ـــ یہں یونہی کچھ بھاوناؤں کے آدھار ایسے نتیجے پر نہیں پہنچ جاتا مہاراج !ـــ یہ چانکیہ نیتی ہے۔ ارتھ شاستر نیتی، جس میں کوئی سنکلپ وکلپ نہیں دو راجے ایک راج میں نہیں سما سکتے اور (قطعیت سے) جب تک چانکیہ یہاں ہے نہیں سمائیں گے۔

چندرگپت : (بلند آواز میں) چانکیہ ! میں جانتا ہوں کہ تم راج دربار کے مان کی تنکے برابر پروا نہیں کرتے۔ تم جانتے ہو کہ میں براہمن ہتیا کا پاپ مول لینا نہیں چاہتا لیکن تم بھول میں ہو چانکیہ ـــــــ۔

چانکیہ : میں آپ کی بھاوناؤں کو سمجھتا ہوں ورشل ! لیکن مجھے اپنے جیون کی پروا

نہیں، میرا آدرش ایک بڑا راجیہ قائم کرنا تھا سو میں نے اپنے آدرش کو پورا کر لیا ہے مجھے صرف افسوس ہوگا کہ یہ راجیہ نادان ہاتھوں میں جا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ اور بس ـــــ جب تک چانکیہ پاٹلی پتر میں موجود ہے وہ پروتک کو یہاں نہیں رہنے دے گا ـــــ (بلند آواز میں) نہیں رہنے دے گا!

چندرگپت: (کچھ ڈھل کر) تمھیں اچھی طرح سے گیان ہے مہا منتری کہ یونانیوں کے ٹڈی دل اور اس کے بڑے سیناپتی سیلوکس کو پروتک کی مدد سے کھدیڑا گیا۔ تم جانتے ہو کہ نند کو پروتک کی وجہ سے شکست ہوئی۔ دوسرے رجواڑوں کو پروتک کے ساتھ مل کر ہرایا۔ کیا تم پروتک کو میرے ہاتھوں مروا کر مجھے وشواس گھاتک بنانا چاہتے ہو؟ کیا تمھاری یہ اچھا ہے کہ میں اس مننشیہ کے لہو سے ہاتھ رنگوں جس کی وجہ سے میں اس سنگھاسن پر براجمان ہوا۔

چانکیہ: جو ہاتھ آپ کے سر پہ تاج رکھ سکتے ہیں وہ اُتار بھی سکتے ہیں۔ اگر مہاراج پرتک ایسا کرنے سے چوک بھی گئے تو اُن سے بڑھ کر مورکھ نہ ہوگا۔ انھوں نے ایسا نہ کیا تو اُن کا پتر لیہ کیتو اپنے پتا کے ادھورے کام کو پورا کر کے ہیں تن من لڑا دے گا۔ وہ ایسے اوشیہ کرے گا ـــــ اوشیہ! پرنتو وہ ابھی چھوٹا ہے۔ ہمارے راجکمار بندوسار سے بھی چھوٹا۔

چندرگپت: (شاہانہ ضد اور غصّے سے) مہا منتری چانکیہ! اس سنسار میں سب کچھ سنبھو ہے لیکن پروتک کی موت ان ہاتھوں سے سنبھو نہیں۔ اس سے میں ایسے ہی پریم کرتا ہوں جیسے اپنے بندوسار سے۔ پروتک میرے ہی شریر کا ایک انگ ہے۔

چانکیہ: جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ وہ آپ کی مرگ نینی الورادھا سے پریم کرتا ہے۔ رنگ بھومی میں الورادھا پروتک کی اچھّا انوسار اس کے دائیں

طرف بیٹھی ہے۔ میں شوک سے کہتا ہوں کہ میرے شترش مہاراج چندر گپت
ابھی تک بھا وناؤں کے سنسار میں براج رہے ہیں۔

چندر گپت : ٹھہرو، مجھے ایک نظر مہانندی اور رنگ بھومی پر ڈال لینے دو۔
(پھر یک لخت شور بلند ہوتا ہے۔ کیونکہ کمرے کے کواڑ
ایکا ایکی کھول دیے گئے ہیں۔ ایک نظر دیکھنے کے بعد
مہاراج کواڑ بند کر دیتے ہیں)

چندر گپت : انورادھا ——! —— انورادھا پروتک کے ساتھ بیٹھی ہے!
لیکن مہامنتری چانکیہ۔ مجھے اس بات کی کلپنا سے بھی بھے آتا ہے کہ
میں ان ہاتھوں سے یہ اپرادھ کروں۔ یہ کبھی نہیں ہوگا۔ پروتک کا خون
ان ہاتھوں سے نہیں ہوگا۔ اس کے چنتن ہی سے میرے شریر میں
ایک کنپن سا پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ مہا پاپ ہے —— یہ گھور
اپرادھ ہے۔

چانکیہ : اس پاپ اور پنیہ کا پھل مجھے لینے دیجیے —— مجھے، جو اس پاپ اور
پنیہ سے اوپر ہے۔ آج سے ہزاروں سال پہلے مہاراج کی طرح ارجن نے بھی
اپنا گانڈیو دھرتی پر ڈال دیا تھا، اس لیے کہ اسے رن بھومی میں اپنے
ہی بھائی بندھو، باپ دادا نظر آتے تھے لیکن بھگوان کرشن نے گیتا
اپدیش سے اسے پاپ پنیہ کی اوستھا سے اوپر اٹھا دیا۔ آج پھر گانڈیو
کو دھرتی پر ڈال دیا گیا ہے جس کے لیے میں گیتا نہیں ارتھ شاستر مہاراج
کے سمکھ رکھتا ہوں۔

چندر گپت : پروتک جو کچھ ہے اپنی سینا کی وجہ سے ہے۔ کیوں نہیں اس کی سینا کو
اپنی عقل کے چکرویوہ میں ڈال دیتے؟ اس کے سرداروں کو سندر بالاؤں

کی کھچاؤں میں دے کر اس کا باہو بل کیوں نہیں توڑ دیتے ؟ اس کے بعد پر و تنک کا باقی رہ ہی کیا جاتا ہے ؟ ـــــ (کانپتے ہوئے) نہیں نہیں ایس پر و تنک کو مارنے کی کلپنا نہیں کر سکتا۔

چانکیہ : مہاراج ! ایک بڑے اُدّیش کے سامنے پر و تنک کوئی مولیہ نہیں رکھتا وہ کیول شطرنج کی ایک گوٹ ہے۔ آپ کو اُنتی کی سیڑھی پر چڑھنا ہے اس کے لیے ایک پر و تنک تو کیا اگر آپ کو سہنسروں پر و تنک بھی مارنے پڑیں تو بھی آپ کو سنکوچ نہیں کرنا چاہیے !

چندر گپت : (غور کرتے ہوئے) سہنسروں پر و تنک ! ـــــ اس کے لیے جو ایک پر و تنک کو مارنے سے بھی گھبراتا ہے۔

چانکیہ : آپ نہیں سمجھتے مہاراج ! جب آپ کو چھت پر جانا ہوتا ہے تو آپ کو اس بات کا خیال نہیں ہوتا کہ آپ کے پاؤں تلے جو سیڑھی ہے وہ دیودار کی ہے یا آبنوس کی۔ سمراٹ کو سروسریشٹ ہوتے ہوئے اس بات کا خیال نہیں ہونا چاہیے کہ اس کے پاؤں تلے کھوپڑیاں ہیں یا اینٹ اور پتّھر ـــــ !! (نسبتاً بلند اور مصمّم آواز میں) اور سمراٹ چندر گپت کو یہ بھی جاننا چاہیے کہ دوسری سیڑھی ہمیشہ پہلی سیڑھی سے اونچی ہوتی ہے . . . .

(راج دُوت بھاگتا ہوا آتا ہے)

راج دُوت : مہاراج ! ـــــ مہاراج !!

چندر گپت : (گھبرا کر) کہو دُوت کیا ہوا۔ کیا خبر لائے ہو ؟

راج دوت : (گھبرا کر) مہاراج پانچویں چکّر میں مہانندی پیچھے رہ گیا۔

چندر گپت : مہانندی پیچھے رہ گیا ؟ ـــــ مہامنتری چانکیہ ـــــ

راج دوت : ہاں مہاراج ! چھٹے چکّر میں اُس کے مُنہ سے خون کے ڈکلے آنے

لگے۔ اور جب وہ چھٹا چکّر سمپورن کر رہا تھا ــــــ

چندر گپت : چھٹا چکّر سمپورن کر رہا تھا تو ــــ ؟

راج دوت : مہا نندی گِرا اور گرتے ہی اُس نے پران دے دیے ــــــ۔

چندر گپت : پران دے دیے ــــ مہا نندی مر گیا ؟ ــــ راج دوت !!

راج دوت : اور اب وہ رنگ بھومی کی دائیں طرف ایک پتّھر کے ٹکڑے کی طرح سرد اور سخت پڑا ہے۔

چانکیہ : اور یہ چندر گپت پر وِتک پریم کی دوسری بلی ہے۔ مہا نندی کو گوارہ گھاس کھلائی گئی جس سے اس کی انتڑیاں کٹ کٹ کر باہر آ گئیں اور اس نے پران تیاگ دیے۔

چندر گپت : مہا منتری چانکیہ ! کیا یہ تمھیں سب کچھ پہلے معلوم تھا ؟ ہمارے پریم میں یہ دوسری بلی کیسے ہوئی ؟ ــــــ

چانکیہ : پہلی بلی ہرگ نینی انورادھا ہے۔

چندر گپت : اوہ چانکیہ ، آج سے پہلے میں اپنے آپ کو ایک سمراٹ سمجھتا تھا لیکن مجھے انو بھو ہوتا ہے کہ میں ایک انسان بھی ہوں۔

چانکیہ : اور اسی میں سمراٹ کی ہار ہے۔

چندر گپت : اِس سمے مجھے اپنی ہار کا آبھاس دینا اچھّا نہیں چانکیہ۔ میرا سب سے زیادہ پیارا مہا نندی رنگ بھومی میں مرا پڑا ہے۔ دوت کے کہنے کے مطابق " ایک پتھر کے ٹکڑے کی طرح سرد اور سخت !!! " اور پھر انورادھا ــــ ؟ (کچھ سوچ کر) چانکیہ ! پر وتک بیچارہ نردوش ہے۔ اگر وہ انورادھا کی سی سُندری کو چاہنے لگا ہے تو یہ ایک سوبھاوِک بات ہے۔ لیکن انورادھا ــــ تم انورادھا کو ٹھکانے کیوں نہیں لگا دیتے

اُسے کیوں نہیں دیتے؟ (لہجہ بدل کر) اس وقت سمراٹ چندر گپت بول رہا ہے چانکیہ ـــ!

چانکیہ : (دیوانہ وار ہنستا ہے) پروتک کو مرنا ہوگا ـــ اور ساتھ ہی الورادھا کو بھی ـــ سمراٹ چندر گپت! ہا ہا ہا ـــ !!!

چندر گپت : مجھے بہت زیادہ نہ ڈراؤ چانکیہ! تم جو جی چاہے کرو۔ لیکن میرے ہاتھوں کو پروتک کے خون سے بچاؤ۔ میں تمہاری منت کرتا ہوں۔

چانکیہ : آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں مہاراج! میں عرصے سے الورادھا کو بس پر پال رہا ہوں اور پروتک اُسے چاہتا ہے ـــ۔

چندر گپت : (سخت حیران ہو کر) تم نے یہ کب سے شروع کیا ہے؟

چانکیہ : جب سے آپ پاٹلی پتر کے تخت پر مہاراج پروتک کی مدد سے بیٹھے ہیں۔ . . .

چندر گپت : (بلند آواز میں) چانکیہ!

چانکیہ : ہاں مہاراج! الورادھا کی پروتک سے شادی ہوگی۔ اس وقت آپ مہانندی کو مرگھٹ میں لے جانے کے لیے اُٹھیے ـــ

(چندر گپت غم اور فکر میں بسے ہوئے سامنے دروازے کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتے ہیں۔ پیچھے چانکیہ کے نپے تلے مضبوط قدم بڑھتے ہیں، ہلکی ہلکی دردناک ٹیون کے ساتھ پردہ گر جاتا ہے۔)

تیسرا منظر

انورادھا کا گھر ـــــ اس کے یوون کا مادھوی کُنج!
شنگار کی چیزوں کے ساتھ ہی پلنگ پڑا ہے جس کے کنارے
ایک جڑاؤ تھال میں دھوپ اور ملیاں جل رہے ہیں۔ ملیان کی لَو
اور انورادھا ایک دوسرے کے متوازی کھڑے ہیں جیسے جیسے
انورادھا ہلتی ہے ملیان کی لَو بھی ہل جاتی ہے۔
انورادھا انیس بیس کی ایک بے چین یُوتی ہے۔ اس کی جوانی
سرما کی ٹھنڈی آگ کی طرح ہے ـــــ کوئی دُور رہے تو جم جائے
قریب آئے تو جل جائے۔ اس وقت انورادھا نے اپنے لمبے لمبے
کیش کندھے پر رکھے ہیں۔ یوں معلوم ہوتی ہے جیسے صندل کے
پیڑ پر شہد کا چھتہ ہے......
دروازہ تھپتھپایا جاتا ہے جس کے ایک پل بعد ایک
انگ رکھشکا اندر آتی ہے۔

انگ رکھشکا: کماری انورادھا!
انورادھا: کون ہے؟ ـــــ دیویانی تم ہو ـــــ کہو کیا ہے؟
انگ رکھشکا: مہارانی دُردھر پدھارتی ہیں ـــــ انھیں آپ سے ملنے کی اچھّا ہے۔
انورادھا: کون؟ ـــــ مہارانی دُردھر؟... میرے سوبھاگیہ، میں آتی

ہوں ______

(سب کام چھوڑ چھاڑ دروازے کی طرف بڑھتی ہے اور بڑی عزت سے مہارانی کو اندر لاکر بٹھا دیتی ہے۔ انگ رکھشک باہر چلی جاتی ہے۔ دروازہ کھلتے ہی دور سے ہَوَن یگیہ اور منتروں کی آوازیں سُنائی دیتی ہیں)

انورادھا:۔ مہارانی! داسی پرنام کرتی ہے۔

دُردھر:۔ انورادھا! میں تمھارے درشن کرنے آئی ہوں۔

انورادھا: (حیرانی سے) میرے درشن؟ ______ (ہنستی ہے) مہارانی، میں بڑی بھاگیہ شالی ہوں۔

دُردھر: میں تم سے ایرشا کرتی ہوں انورادھا! یہ جان کر شاید تم بہت حیران ہوگی۔

انورادھا: ایرشا؟ مہا سمراٹ چندر گپت کی پتنی ایک تچھ جیو انورادھا سے ایرشا کرتی ہے۔ آپ مجھے بنا رہی ہیں مہارانی!

دُردھر:۔ یہ میرا دُربھاگیہ ہے کہ تم یوں سمجھتی ہو۔ میں خوش ہوں کماری انورادھا کہ تم ایک سمراٹ سے نہیں بیاہی جارہیں ایک منشیہ سے بیاہی جارہی ہو ___ پروتک سے جو تمھیں دل سے پریم کرتا ہے۔ تم اُس سے شادی پر خوش ہونا؟

انورادھا: میں بھلا خوش کیوں نہ ہوں گی، مہارانی!

دُردھر:۔ میرے من میں پروتک کی بہت عزت ہے۔ وہ پریم کرنا جانتا ہے لیکن وہ نہیں جانتا ان چند گھڑیوں میں اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے . . . .

انورادھا: (گھبراتی ہے اور اس کے سر کے بال بکھر جاتے ہیں) یہ آپ نے کیا کہا مہارانی جی! ______ ان چند گھڑیوں میں ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟

دُردھر:۔ میں تم پر ستیہ کا بھید کھولنے آئی ہوں، انورادھا! تم سہاگ کی رات

دیکھنے نہ پاؤ گی!

الورادھا: مہارانی جی!

دُردھر: ہاں الورادھا! میں یہ سب کچھ اس لیے کہہ رہی ہوں کہ میں پرونتک کو ایک مہان آتما سمجھتی ہوں، اور میں نہیں چاہتی تمھارے ساتھ چھو کر وہ مرتیو کو پراپت ہو جائیں۔

الورادھا: میرے ساتھ چھو کر مرتیو کو پراپت ہو جائیں گے؟ ...... یہ کیوں ہو جائے گا مہارانی جی؟ کیا میں ایسی دُربھاگنی ہوں کہ میرے انگ سے انگ ملا کر مہاراج ــــــ میں مہاراج پرونتک سے پریم کرتی ہوں اور آپ پریم کو سروا اُونچ بھاونا سمجھتی ہیں، اس پریم کی سوگند دیتی ہوں مجھے سب کچھ سنائیے، اس بات کا کوئی اُپائے بتا دیجیے۔

دُردھر: بھولی لڑکی ــــــ تم نہیں جانتیں کہ برسوں سے تمھیں کھانے کے ساتھ زہر دیا جاتا رہا ہے اور اب وہ زہر تمھاری نس نس میں دیاپت ہو چکا ہے تمھارے انگ سے انگ ملاتے ہی مہاراج پرونتک مرتیو کو پراپت ہو جائیں گے اُپائے یہ ہے کہ تو بیاہ سے یہ بات ان کے کانوں تک پہنچا دے تا کہ وہ اپنے آپ کو بچا سکیں پرونتک ابودھ ہیں انھیں اس بات سے سچیت کر دینا چاہیے۔

الورادھا: (رو کر) اوہ! یہ کس نے کیا؟ ــــــ کیا مجھے اب تک زہر پہ پالا گیا؟ مجھے وشواس ہے یہ سب کچھ مہاراج چندرگپت نے نہیں کیا؟

دُردھر: اس زہر کو تمھارے شریر میں دیاپت کرنے والا وہی تکشک ہے جسے لوگ مہامنتری چانکیہ کہتے ہیں۔

الورادھا: (سوچ کر ــــــ اور غصے میں) تبھی میرا دل اور دماغ آگنی میں جلا کرتے تھے تبھی میری آنکھوں سے ہر سمے ایک جو

تھی ــــــ۔

دردھر: ہم سب مہامنتری چانکیہ کے ہاتھوں میں کھیلنے والی کٹ پتلیاں ہیں کون کہہ سکتا ہے مہانندی کو پروتک نے مارا ہے۔ . . .

انورادھا: مہاراج پروتک ایودھہ ہیں مہارانی! اُن کے ہاتھوں سے کوئی ایسی بات سنبھو نہیں۔ . . . لیکن مہارانی جی! میں اپنے پریمی کو نہیں مرنے دوں گی۔ میں ہَوَن کنڈ کے پاس پہنچتے ہی مہاراج پروتک کو سب کچھ بتا دوں گی۔ . . . . میں انھیں مہامنتری چانکیہ کے پھیلائے ہوئے جال میں نہیں پھنسنے دوں گی ــــــ۔

دُردھر: میں اسی بات کا گیان پیدا کرنے کے لیے تمھارے پاس آئی ہوں۔

انورادھا: لیکن مہارانی ......!

دُردھر: لیکن کیا؟

انورادھا: میں مہاراج پروتک کو بچا دوں گی ــــــ لیکن مہارانی، میرا کیا ہوگا میں جیون میں کوئی سکھ نہ دیکھ پاؤں گی، میری کوئی منگ پوری نہ ہو گی۔ ابھی میرا من پریم پرلاپ کر رہا تھا ــــــ اور ابھی . . . . .

(ایک ہلکی سی تھپتھپاہٹ کے بعد دروازہ کھلتا ہے راج دوت اندر آتا ہے۔ ساتھ ہی منتروں اور ہون یگیہ کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔)

راج دوت: کماری انورادھا! ــــــ یہ ہار مہامنتری چانکیہ نے بھیجا ہے۔

دردھر: مہامنتری نے جے مال بھیجی ہے۔

انورادھا: (روتے ہوئے) مہامنتری نے ودھوا ہونے کا سندیش بھیجا ہے پہلی رات ہی دُر بھاگ کی رات ہو گی (جے مال لے لیتی ہے) لیکن مجھ سے کوئی نہ ــــــ ا

سہاگ نہیں چھین سکے گا ــــــ کوئی نہیں چھین سکے گا۔ مہارانی میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں آپ نے اتنا بڑا اُپکار کیا ہے کہ میں اسے جنم جنم نہیں بھول سکوں گی۔

(انگ رکھشکا آتی ہے)

انگ رکھشکا: مہارانی جی! ــــــ مہاراج آپ کو اور کماری انورادھا کو یاد کر رہے ہیں، کماری جی کنڈ کے قریب پہنچے . . . . .

وردھر: چلو انورادھا! بھگوان تمھیں بل دیں۔

(کماری انورادھا اور مہارانی وردھر دروازے کی طرف بڑھتی ہیں، پردہ گرنے سے پہلے منتروں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔)

چوتھا منظر

منڈپ

منڈپ کے دائیں طرف لوگ بیٹھے ہیں شایدان میں ملیہ کینو اور بندوسار بھی ہیں۔ بائیں طرف منڈپ سے ذرا پرے مہاراج چندرگپت اور مہامنتری چانکیہ ایک تخت پوش پر براجمان ہیں۔ پردہ اُٹھنے پر مہارانی دُردھر مہاراج چندرگپت کے پہلو میں آ بیٹھتی ہیں۔

درمیان میں ہون کُنڈ کے دو طرف براہمن گھرت اور سامگری کُنڈ میں پھینک رہے ہیں ایک طرف مہاراج پروتک شادی کا سیندوری جوڑا پہنے بیٹھے ہیں۔ آگ کے قریب ہونے کی وجہ سے اُن کا چہرہ بھی سیندوری ہو رہا ہے... کچھ دیر بعد کماری انورادھا جے مال لیے آہستہ آہستہ آتی ہے۔

منڈپ کے چاروں طرف زبردست پہرہ ہے

چندرگپت: (انورادھا کو دیکھ کر) چانکیہ!

چانکیہ: مہاراج!

چندرگپت: انورادھا ——— کیسے شرد رتو کے بادل کی طرح آہستہ آہستہ چلی آرہی ہے..... وہ کتنی سندر دکھائی دیتی ہے، کتنی سندر اور پرنتو:

چانکیہ: (آہستہ سے) وہ پہلے بھی مل رہے ہیں! (ہنستے ہیں)

(پیچھے منتروں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں)

انورادھا: (آہستہ آواز میں) مہاراج!

پرونک: انورادھے!

انورادھا: مہاراج! مجھے آپ سے ایک بات کہنا ہے جو شاید آپ کو آج تک نہیں معلوم۔

پرونک: کہو پریہ۔

انورادھا: (رُندھے ہوئے گلے سے) میں یہ سہن نہیں کر سکتی۔ پرماتما میرے سُہاگ کو امر رکھے مہاراج! مجھے برسوں سے بس پرپا لاجا رہا ہے —— میں وِش کنیا ہوں، آپ میرے شریر کو چھو کر...........

پُرونک: (ہنستے ہوئے) ....باولی!.... انورادھے! کیا تم سمجھتی ہو کہ پرونک ان باتوں کو نہیں جانتا؟

انورادھا: مہاراج —— آپ ان باتوں کو جانتے ہوئے بھی؟.... مہاراج مہا منتری چانکیہ آپ کو اپنے راج پاٹ کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں۔

پرونک: (پھر ہنستا ہے) اور پرونک راج پاٹ کو پریم کی بھینٹ چڑھا رہا ہے۔ انورادھے! آؤ آج اِن راج پاٹ کے لوبھیوں کو بتا دیں کہ پریم پرجیون نچھاور کرنا پریمی، ایک تُچھ وستو سمجھتے ہیں.... آؤ مجھے اپنا ہات دو۔

انورادھا: مہاراج آپ نے راج پاٹ....

پرونک: راج پاٹ سنکے لیے میں نے لڑتا ملیہ کیتو کو سونپ دیا ہے.... ملیہ کیتو اِن سب باتوں کو سمجھتا ہے ——۔

انورادھا: (آواز میں رقّت ہے) مہاراج! آپ نے میری آنکھیں کھول دی ہیں میں اپنا ہات آپ کے ہاتھ میں دیتی ہوں.... مجھ ایسا سہاگ نہ کسی کو ملا ہے نہ ملے گا۔

(پھر منتروں کی آوازیں آتی ہیں۔ انورادھا اپنا ہاتھ پرونک

کے ہاتھ میں دینے سے پہلے اُن کے گلے میں جے مال ڈال دیتی ہے۔ ..
پھر آگ کے سامنے بیٹھے ہونے کی وجہ سے زہر پرو تک کے جسم میں
سرایت کر جاتا ہے ـــــ آناً فاناً پرو تک لوٹنے لگتے ہیں)

انگ رکھشکا: مہاراج پرو تک لوٹنے لگے!

راج دُوت: مہاراج پرو تک!

انورادھا: سوامی!

دردھر: منشتا کے اوتار، مہاراج پرو تک کی جے! (چندر گپت سے) مہاراج
آپ نے دیکھا؟

چندر گپت: ہاں مہارانی، میں نے دیکھا (دُکھ کر) پریم پر بلیدان دینے
والے پرو تک، تیری جے!

چانکیہ: پہرہ دارو، املیہ کینو کو گھیرے میں لے لو۔ ۔ ۔ دو پہری! ۔ ۔ ۔ ہاہا ہا۔ ۔ ۔ !!
دیوانے ۔ ۔ ۔ پاٹلی پتر سمراٹ کی جے!

(منظر پہ فوراً پردہ گر جاتا ہے)

●●

کھیل چانکیہ کے چند ہندی الفاظ کا ترجمہ ذیل میں دیا گیا ہے

انشچت	بے یقین
ششیہ	بچہ، شاگرد
جننی	ماں
بادھک	حائل
آشنکا	شک و شبہ
سندیہہ	شک
سرو اُچ اوستھا	سب سے اونچی منزل
کٹل	جھوٹا
کٹھور	سخت دل
گھرنا	نفرت
درشٹی	نقطۂ نظر
تتوگیان	فلسفہ
سدھانت	کلیہ
اپواد	استثنیٰ
مرتیو ڈنڈ	موت کی سزا
پریشد	قانون ساز مجلس

گؤ آدھیاکش	گائے بیلوں کے محکمے کا مہتمم
نو آدھیاکش	جہازوں کے محکمے کا مہتمم
ہستادھیاکش	ہاتھیوں کے محکمے کا مہتمم
اسوادھیاکش	گھوڑوں کے محکمے کا مہتمم
رتھ آدھیاکش	رتھوں کے محکمے کا مہتمم
وشرانتی ستھان	آرام گاہ
رنگ بھومی	کھیل کا میدان
انومان	پیش خیمہ، اندازہ
اسنبھو	ناممکن
استھر	سیمابی، ایک جگہ قائم نہ رہنے والا۔
اکارن	فضول، بے فائدہ
ستیا	سچائی
اماتیہ	مشاورتی وزرا
ویوہارک	کارکن
سمہرتا	ریاست کے مختار

ورشل	راجے کا خطاب
گانڈیو	ارجن کی کمان
چکرویوہ	نرغہ جس میں کوروؤں کی فوج نے ویرابھیمنیو کو گھیر لیا تھا۔
آدیش	مقصد
اُنتی	ترقی
سہنسروں	ہزاروں
سنکوچ	احتراز، شک
ہرن نینی	ہرن کی سی آنکھوں والی
آبھاس دینا	جتا دینا
یُوتی	نوجوان لڑکی

کوکل	کوئل۔ پنچھی
مدھو	شراب
کمپت ادھر	کانپتے ہوئے ہونٹ
مدھو مدرا	میٹھی شراب
سبھاگیہ شالی	اچھی قسمت والی
ایرشا	حسد
تچھ جیو	بے بضاعت ہستی
ابودھ	بے قصور، بے خبر
سچیت	آگاہ
ویدھویہ	بیوگی، ودھاگ
ششر رتو	سردیوں کا موسم۔
امر	غیر فانی
لوبھی	لالچی

تلچھٹ

ماں : ایک بیوہ عورت جس نے یوگ کو پالا ہے

یوگ : ایک "یتیم" لڑکا

جوتن کی ماں : محلّے کی ایک عورت

شری پت رائے : یوگ کا باپ

منتظر

ایک معمولی سا کمرہ، جس میں سامان قدرے بے ترتیب پڑا ہے۔ مثلاً ایک کرسی پڑی ہے تو اس کے بازو پر دھوئے جانے والے کپڑے رکھے ہیں۔ پلنگ کے قریب ایک تھال پڑا ہے جس کا مطلب ہے ابھی کسی نے کھانا کھایا ہے لیکن برتن نہیں اٹھوائے۔ الگنی پر ایک چھتری لٹکی ہوئی ہے جس کی تانیں نظر آ رہی ہیں وغیرہ۔

درمیان میں ایک سلائی مشین ہے جس کے ارد گرد کترن بکھری ہوئی ہے۔ اس کمرے میں کھڑے ہونے سے نظر رسوئی میں جاتی ہے۔ رسوئی بھی دراصل اسی کمرے کا ایک حصہ ہے لیکن اسے کھوکھے کی بیکار لکڑی سے کمرے سے علاحدہ کر دیا گیا ہے۔ رسوئی کے پاس سے ایک راستہ سامنے ٹوٹی پھوٹی دیوار کے پاس جا کر رک جاتا ہے جہاں ایک نالی ہے۔ نالی کے پاس دائیں طرف ایک ٹاٹ لٹکا ہے جس کے پیچھے غسل خانہ ہے۔

پردہ اٹھنے پر ماں ـــــ یوگ کی ماں، کتر بیونت میں مشغول نظر آتی ہے۔ روشنی کم ہونے سے آنکھوں پر زور دینا پڑتا ہے۔ وہ ستائیس برس کی ایک جوان عورت ہے۔ لیکن بیوگی کی مصیبتوں کے باعث زیادہ عمر کی دکھائی دیتی ہے۔ آج بھی اگر اچھے کپڑے پہنے تو خوبصورت نظر آئے۔

یوگ ایک چودہ ۱۴ سال کا ذہین لڑکا ہے جو کسی بات سے

خفا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے اور کبھی اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

ماں : نہیں بیٹا یوگ! میں تمھیں اتنا پیسا نہیں دے سکتی... میں ایک غریب عورت ہوں۔

یوگ : اگر یہی بات تھی ماں۔ تو تم نے مجھے لکھانے پڑھانے کی کوشش ہی کیوں کی تھی؟ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ تھوڑی بہت شُدبُد حاصل کرنے کے بعد میں چچا کے کارخانے میں نوکر ہو جاتا اور وہاں سپرنگ بنانے کا کام سیکھ لیتا۔

ماں : بیٹا، مجھے کیا پتا تھا ہر دوسرے روز میرے لیے نیا پروانہ آئے گا۔

یوگ : نیا پروانہ کیسا؟

ماں : یہی کبھی تمھیں سیر تماشے کے لیے پیسے دینا ہوں گے۔ اور کبھی اسکاؤٹنگ کی وردی سلوانے کے لیے پیسے درکار ہوں گے۔ اگر تمھیں رومال کی اتنی ضرورت ہے تو کیوں نہیں ایک سادہ سا.....

یوگ : نہیں ماں۔ مجھے ایک خاص کپڑے کا اسکارف چاہیے۔

ماں : مجھے تمھاری ان ضرورتوں کا کیا پتا؟ تم دیکھتے ہو میں سارا دن سلائی کرتی رہتی ہوں جب سے بدھوا ہوئی رو رو کر میں نے آنکھیں خراب کر لیں اور اب میری نگاہ سلائی پر نہیں رُکتی... میری نگاہیں ایک جگہ جم کر رہ جاتی ہیں۔

یوگ : تو تم عینک کیوں نہیں لگوا لیتیں ماں؟... اسپتال سے نمبر تو لے آئے تھے۔

ماں : ہاں نمبر تو لے آئے تھے لیکن عینک خریدنے کے لیے پیسے چاہییں۔

یوگ : اوہ ! پھر پیسے . . . .
ماں : ہاں پیسوں کے بغیر کیا ہو سکتا ہے اس سنسار میں ؟
یوگ : ماں ، دُنیا میں پیسوں کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا ؟ . . . . گاؤں میں تو لوگ ابھی تک گندم لے آتے ہیں یا عورتیں دکاندار کو کپاس دے جاتی ہیں اور اس کے عوض انھیں آٹا دال اور نمک پیسے سب کچھ مل جاتا ہے . . . ہمارے ہاں جو گندم پڑا ہے . . . .
ماں : ہاں بیٹا ! وہاں اس قسم کا تبادلہ ہو سکتا ہے ۔ شہر میں لوگ پیسے کے عوض کوئی چیز دے سکتے ہیں ۔ اس کے بغیر نہیں . . . .
یوگ : جوتن کی ماں بیوہ ہے ۔ وہ کیسے کما لیتی ہے ؟ جوتن کو کبھی کتابوں کے لیے نہیں رونا پڑا ، اور نہ کبھی . . . . . .
ماں : (جھڑک کر) خاموش ! سوچ کر بات کیا کرو ۔ جوتن کی ماں جس طرح پیسے کما لیتی ہے ، میں اس طرح پیسے نہیں کمانا چاہتی ۔
یوگ : (حیران ہو کر) وہ کیسے کما لیتی ہے ؟ ——— جوتن کی ماں !
ماں : خبردار آئندہ کبھی جوتن کی ماں کا نام لیا ۔ سمجھ گئے ؟
یوگ : کیوں ماں ، جوتن کی ماں کا نام لینا گناہ ہے ؟
ماں : ہاں گناہ ہے !
یوگ : (رو کر) میں نہیں جانتا ۔ میں کچھ نہیں جانتا ، مجھے اسکارف چاہیے اور سلسلہ حساب نمبر ۸ اور بس . . . ماں ! تمھیں اس کے بعد کچھ بھی لانے کے لیے نہیں کہوں گا ۔
ماں : میرے لال تم ہی بتاؤ . . . میں کیا کروں ، کل میں نے جمنا لال کے ہاں سے بوتلیں اکٹھی کیں ۔ ان سے سخت بدبو آتی تھی ۔ میں نے انھیں دھویا اور

اس کے بعد پچھلے تین مہینے سے اکٹھا کیا ہوا چھان نکالا اور اس کو بیچ ڈالا۔
سوا تین روپے ملے . . . . اب تم ہی بتاؤ کہ کھانے پکانے کے لیے کیا
رکھوں اور تمہارے حساب اور رومال کے لیے کیا دوں . . . . ؟

یوگ : یہ ٹھیک ہے ماں . . . . پھر . . . . . (منہ چھپا لیتا ہے گویا رو رہا ہے)

ماں : پھر کیا . . . . تم پھر رونے لگے سودائی !

یوگ : (روتے ہوئے) تم نے کہا تھا نا تمہارا باپ لڑائی سے پہلے پردیس چلا گیا . . . .
اور وہاں مر کھپ گیا۔ اور اس کے جاتے ہی تمہاری ماں صدمے سے مر گئی
اور تم نے مجھے لے کر پال لیا . . . . .

ماں : ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ لیکن اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے ؟

یوگ : میں کئی بار سوچتا ہوں . . . . . تم نے مجھے آخر کیوں بچا لیا ؟ کیوں اپنا بیٹا
بنا لیا ؟ تم مجھے نہ لاتیں تو میں بھوک اور پیاس سے تنگ آ کر مر جاتا، زیادہ
سے زیادہ یہی ہوتا نا۔ تمہارے دکھ کا کارن تو نہ ہوتا۔

ماں : (لرزتی ہوئی آواز میں) اچھا بیٹا میں نے جو تمہیں بچا لیا ——— بڑی بھاری
غلطی کی۔ کبھی کسی انسان سے غلطی بھی ہو ہی جاتی ہے۔

(وقفہ ——— ایک ٹھنڈی سانس لے کر)

کاش میں ایک بار اپنی کوکھ سے بیٹا جن لیتی . . . . چاہے وہ پیدا ہونے کے فوراً
بعد مر ہی کیوں نہ جاتا۔ کبھی دوسرے کا بیٹا بھی اپنا ہوا ہے۔ لاکھ کرے کوئی۔

یوگ : (گھبرا کر) یہ بات نہیں ماں . . . . ایسا کرو گی تو میں کہیں چلا جاؤں گا۔

ماں : چلے جاؤ گے تو کیا ہو گا ؟ ابھی کیا تم میرے ہو ؟ یہ جو باتیں تم نے کی ہیں . . .

یوگ : (لپٹ کر) نہیں ماں . . . میں تیرا ہوں تیرا۔ اور کسی کا نہیں۔ آج میری
اپنی ماں بھی آ جائے تو میں اس کے پاس نہ جاؤں۔ تم نے مجھے پالا ہے۔

ماں : آئے ہائے - میں احسان جتا رہی ہوں نا !

یوگ : نہیں ماں ، میں نے یہ کب کہا ؟ میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ میری وجہ سے تمھیں اتنا کلیش ہوتا ہے ۔ میں بڑا ہو رہا ہوں اور میری ضرورتیں بڑھتی جا رہی ہیں ۔ میرا پیٹ کھانے کو مانگتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔

ماں : بیٹا ، پیٹ کی بات نہ کرو ۔ پیٹ بھر کھانے کے لیے تو ہمارے پاس کمی نہیں ہے ، ہاں پیٹ کے علاوہ یہ رومال اور کتابیں ۔ ۔ ۔ ۔

یوگ : کتابوں کے بغیر بھلا کوئی کیسے پڑھ سکتا ہے ؟

ماں : میں نے سنا ہے کہ پڑھنے والوں نے دوسروں سے مانگ تانگ کر کتابیں پڑھی ہیں ۔ لائبریریوں میں جا جا کر کام کیا ہے ۔ تمھارے ہی چچا اتنے بڑے کیسے بن گئے ؟ اُن کے گھر میں کھانے کو روٹی تھی نہ تن ڈھانپنے کو کپڑا ۔ ماں باپ نے انھیں ان کی بُوا کے ہاں گجرانوالہ بھیج دیا ۔ جہاں یہ اپنے پھپھیرے بھائی کو کھلایا کرتے تھے اور روٹی کھا لیتے تھے ، گھر پڑھنے کے لیے بتی نہ تھی اور تمھارے چچا سڑکوں کی روشنیوں کے نیچے جا جا کر پڑھا کرتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔

یوگ : ماں میں سمجھ گیا ۔ ۔ ۔ ۔ سب کچھ سمجھ گیا ۔ دراصل بات یہ ہے کہ تم نے مجھے بہت پیار کیا ہے ۔ جب بھی میں نے رو دھو کر تم سے کچھ مانگا ہے تم نے کسی نہ کسی طرح مہیا کر دیا ہے ۔ اس سے میری عادت بگڑ گئی ۔ ۔ ۔ ۔ اب میں جانتا ہوں ۔ تم بہت مجبور رہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ماں : ہاں بیٹا ۔ میں ان دنوں بہت مجبور ہوں ۔ تمھارے سامنے میں گھر دائی بُلواتی رہی اور پیٹ ملواتی رہی ۔ میں نے اس مہینے سینے پُرونے کا کام ہی نہیں کیا اور نہ موزے بُنے ہیں ۔

یوگ : نہیں ماں ۔ ۔ ۔ ۔ مجھ سے بھول ہوئی ۔

ماں : تو اب تم اپنے ماسٹر کو کیا جواب دو گے ؟
یوگ : میں کہوں گا ہیں اسکاؤٹ نہیں بننا..... اگرچہ وہ مجھے بہت پسند کرتے ہیں..... انھیں دُکھ ہوگا۔ پر ماں جو دکھ تمھیں ہو رہا ہے.....
ماں : اچھا وہ تمھیں اتنا چاہتے ہیں کہ تمھارے اسکاؤٹ نہ ہونے پر انھیں دکھ ہوگا؟
یوگ : ہاں ماں۔
ماں : ہائے گھر بھر میں ایک مرد کے نہ ہونے سے یہ کچھ ہو جاتا ہے..... مرد بیس قسم کے کام کر سکتا ہے عورت کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ پھر وہ مہینے میں بیس دن بیمار رہتی ہے میں تو روتی ہوں کہ میں عورت کیوں ہوئی !
یوگ : اس میں تمھارا کیا قصور ہے ماں.....؟
ماں : نہیں اس میں میرے ہی کرموں کا دوش ہے۔
یوگ : دنیا میں لاکھوں عورتیں ہیں جو راج کرتی ہیں۔ ہیڈ ماسٹر کی بیوی ہے وہ ہیڈ ماسٹرنی ہو گئی۔ پوچھو بھلا اس نے ہیڈ ماسٹرنی بننے میں کونسا کالج پاس کیا ہے۔ ان دنوں گورنر کی بیوی اسکول کی عمارت کا پتھر رکھنے آئی تھی تو
ماں : ہاں بیٹا۔ عورت مرد ہی سے رتبہ پاتی ہے۔
یوگ : ایسا کیوں ہے ؟
ماں : کیوں ہے ؟..... جب سے دنیا بنی ہے ایسے ہوتا آیا ہے۔ مرد کے بغیر عورت کچھ بھی نہیں۔
یوگ : مرد تمھارے بغیر سب کچھ ہیں ؟
ماں : ہاں سب کچھ۔

(وقفہ ـــــ ماں کچھ سنبھل جاتی ہے)

یوگ : تو میں مرد بنوں گا۔ اور سب کچھ ہوں گا۔

ماں : ہاں، اور میرے بیٹے کی دُلھن آئے گی۔
یوگ : نہیں ماں۔ . . . . میں اُس کے لیے نہیں ۔ تمھارے لیے سب کچھ ہوں گا۔
ماں : جیتے رہو بیٹا! بھگوان تمھیں بہت بڑا آدمی بنائے اچھا تو وہ تمھیں بہت چاہتے ہیں۔ تمھارا اپنا جی بھی چاہتا ہے کہ اسکاؤٹ بنوں اور . . . . . .
یوگ : واہ! . . . . . تو میں اتنی دیر سے رو گیا رہا ہوں ؟
ماں : نہیں بیٹا مجھے ایک بات یاد آ گئی ۔ میں نے تمھاری شادی کے لیے روپے جمع کرنے شروع کیے تھے۔
یوگ : میری شادی کے لیے ؟
ماں : ہاں تمھاری شادی کے لیے . . . اور چار پانچ سال میں تمھارا بیاہ ہوگا یا نہیں؟
یوگ : تو اس کے لیے میں آپ کماؤں گا۔
ماں : اچھا اس کے لیے تم آپ کماتے رہنا . . . . . یہ میں نے روپے اکٹھے کرنے شروع کیے تھے . . . . ابھی تک میرے پاس باون روپے جمع ہوئے ہیں۔ اس سے تم رومال اور کتابیں ———
یوگ : . . . . . ماں!
ماں : انھیں جہاں چاہو خرچ کر لو۔ میرے پاس یہی پونجی تھی . . . . جو میں نے تمھارے سامنے بڑی محنت سے جمع کی ہے۔
یوگ : نہیں نہیں ماں . . . . میں اسے خرچ نہیں کروں گا (خوش ہو کر) لیکن مجھے رومال بنا دو۔ اور باقی پیسے جمع رکھو۔ میری شادی کے لیے نہیں اپنے دردِ سر کا علاج کرو۔ یہ درد جو تمھارا پیچھا ہی نہیں چھوڑتا۔
ماں : اور کتابیں ؟
یوگ : میں ایسے ہی پڑھ لوں گا مانگ تانگ کر گلی کی روشنیوں کے نیچے . . . .

ماں: نہیں بیٹا۔ میں یہ نہ ہونے دوں گی۔ تم ضروری ضروری کتابیں خریدلو۔
... اور باقی .....

(دروازے پر دستک سنائی دیتی ہے)

ماں: یہ ہمارے گھر کون آیا؟
یوگ: گونجی ہوگی۔ تم نے اس کے کپڑے سی دیے ہیں؟ وہ کہہ رہی تھی۔ مجھے
دیاس پوجا سے پہلے کہیں پہنچنا ہے۔
ماں: (زانو پر ہاتھ مار کر) ہائے۔ میں مر گئی! میں نے تو شروع ہی نہیں کیا۔
..... میں اسے بھول ہی چکی تھی!
یوگ: ۔ تو اب کیا ہوگا؟
ماں: (گھبرا کر) نہ جانے کیا ہوگا۔ اُسے کیا مُنہ دکھاؤں گی میں؟
یوگ: میں کہتا ہوں ... ماں تم بیمار بن جاؤ۔ اس چارپائی پر بیٹھ جاؤ۔ تم نے
اس کے کپڑے کاٹے بھی ہیں یا نہیں؟
ماں: میں کہتی ہوں بالکل بھول گئی تھی اس کے کپڑے۔
یوگ: کسی کے بھی کاٹے ہیں یا نہیں؟
ماں: ہاں چاند کی قمیص کاٹی ہے وہ پڑی ہے ...
یوگ: اُٹھو اُٹھو .... میں تمھاری مشین رکھ دیتا ہوں۔ تم مشین
کے اندر وہ قمیص رکھ دو۔ بس اس طرح کہ پتا چلے بخیہ نکالنے کی مہلت
نہیں ملی اور پیٹ میں درد ہونے لگا۔
ماں: نہیں نہیں بیٹا ..... یہ بری بات ہے۔ میں رات کو جاگ کر سی دوں گی اور
تھوڑی سی لعنت ملامت سہہ لوں گی۔ اس کی مجھے عادت ہو گئی ہے۔
یوگ: جب تم وقت پر کام کر دیتی ہو تو پھر بھی لعنت ملامت ہوتی ہے؟

ماں : لوگ میری سلائی کا درزیوں کی سلائی سے مقابلہ کرتے ہیں نا! ور میں اُن ایسا نہیں سی سکتی۔ اگرچہ درزی ایک قمیص کے اڑھائی روپے تک لے لیتے ہیں اور میں کل چھ آنے سے آٹھ آنے تک لیتی ہوں۔

(پھر دستک ہوتی ہے)

ماں : چھجّے سے دیکھو تو کون ہے؟

یوگ : (دور جاتے ہوئے) .... اچھا میں دیکھتا ہوں۔

(ماں سلائی مشین چلانے لگتی ہے)

ماں : کون ہے؟

یوگ : (گھبرایا ہوا آتا ہے) ماں ... ماں، یہ جوتن کی ماں آگئی۔

ماں : اُسے ہمارے ساتھ کیا کام آن پڑا؟ بیٹھے بٹھائے، یہ کیا مصیبت آگئی؟ میرے ہاں اس کا آنا جانا اچھا نہیں .....

یوگ : میں خود نہیں چاہتا وہ ہمارے ہاں آئے ... میں اسے روک دوں؟

ماں : اس طرح کیسے روکا جا سکتا ہے؟ ... چلو یہ بھی اچھا ہوا گونگی نہیں آئی؟

یوگ : صاف کہہ دوں گا کہ ماں کو فرصت نہیں۔

ماں : نہیں نہیں ..... ایسا نہ کہو ... (سوچ کر) اچھا اُسے آنے دو۔

(جوتن کی ماں اپنے آپ چلی آتی ہے)

جوتن کی ماں : (بہت خوش ہے) یوگ کی ماں؟

ماں : ہاں کرشنا۔ کہو کیا بات ہے؟

جوتن کی ماں : میں تمھیں ایک خوش خبری سنانے آئی ہوں۔ ایسی بات جو تم نے زندگی بھر نہیں سنی ہوگی۔

ماں : ہمارے لیے کیا خوشخبری ہو سکتی ہے؟ لاٹری ہم نے نہیں ڈالی اور .....

جوتن کی ماں : لاٹری سے بڑھ کر بات ہے۔
یوگ : تم ایسے ہی باتیں کرتی ہو جوتن کی ماں۔ جانے کیا ہو جائے گا۔ اور جب اصل بات ہوتی ہے تو ٹھس سے رہ جاتے ہیں سب۔
جوتن کی ماں: نہیں یوگ! خاص طور پر تمھارے لیے بہت بڑی بات ہے۔ اس سے تمھیں بہت فائدہ پہنچ سکتا ہے اگر میں کہوں کہ آج تم فقیر ہو اور کل راجا بن جاؤ گے تو تم مان لو گے؟
یوگ :۔ نہیں۔ میں راجا نہیں بن سکتا اور نہ ہی بننا چاہتا ہوں۔
جوتن کی ماں: لیکن اگر تم راجا بن جاؤ تو . . . .
ماں: ادھورا جاہی نہ بن جائے کہیں . . . .
یوگ : لیکن ماں کیا کرے گی؟ . . . . (کچھ یاد آتا ہے) اوہ نہیں . . . ماں میرے ساتھ جا سکتی ہے۔ راجے کی ماں بن کر چلو۔ سمجھ لیا، میں راجا ہوں گا۔ ہماری آٹھویں جماعت میں اس طرح کے سوال نکالتے ہیں۔ فرض کیا کہ "ل" لڑکوں نے امرود کھائے . . . . ہاں جوتن کی ماں! تمھیں اپنے امرودوں کا وعدہ یاد ہے نا . . . .؟
جوتن کی ماں : ہاں اچھی طرح سے۔ میں تمھیں اپنے باغ سے ٹوکروں کے ٹوکرے منگوا دوں گی۔
ماں :۔ اوہو، ایکا ایکی اتنی مہربان کیسے ہو گئیں؟ ـــــ اصل بات کیا ہے؟
جوتن کی ماں :۔ بہت ہی خوشی کی بات ہے، یوگ کی ماں! تم دیکھ نہیں رہی ہو۔ میری آنکھوں میں نیر بھر آیا ہے۔ در اصل مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ بات تم لوگوں سے بیان کر سکوں ـــــ ہے بھگوان! مجھے اتنی شکتی دے کہ . . . . .

ماں :۔ یہ کیا پاکھنڈ ہے ــــ ؟ میں کہتی ہوں کرشنا، کوئی بات نہیں اتنا
خوش نہیں کر سکتی کہ ہم اسے سن کر پاگل ہو جائیں ۔ اور نہ کوئی بات
اتنا غمگین کر سکتی ہے کہ . . . .

جوتن کی ماں : یوگ بیٹا !

یوگ : یہ تمھیں کیا ہو گیا ہے جوتن کی ماں، ــــــــ جوتن کیا کہہ رہا ہے ؟

ماں : یوگ کی یہ بہت بُری عادت ہے کہ جو آخری چیز اس کے دماغ میں آتی ہے
اسی کی طرف پلٹ جاتا ہے ۔ باتیں کسی خوش خبری کی ہو رہی تھیں بیچ میں
امرودوں کا ذکر آ گیا ۔ اب امرودوں کا ذکر ہو رہا ہے تو جوتن کا قصہ لے
بیٹھے ــــــــ

یوگ : ہاں ! میں کہہ رہا تھا، میں اپنے آپ کو "لا" فرض کر لیتا ہوں یعنی راجا !

جوتن کی ماں : فرض کرنے کی کوئی بات نہیں ۔ تم اب سچ مچ راجا ہو !

ماں : اور میں ؟

یوگ : تم راجا کی ماں ۔

جوتن کی ماں : راج ماتا !

ماں : اچھا چلو گپ ختم ہوئی ۔ اب اصلی بات بتاؤ ــــ (ٹھنڈی سانس لیتے
ہوئے) ہماری ایسی قسمت کہاں ــــ ؟ ابھی کل ہی کیرل ودیا کا ایک
پنڈت آیا تھا، اُس نے کچھ ہندسے لکھے اور اصل میں ٢٣ کا لزن
(فالزن) کے جمع کرائے اور اُسے تین پر تقسیم کرایا، سب کچھ تقسیم
ہو گیا ــــــــ جس کا مطلب تھا لاکھ کی بجائے اُلٹا نقصان ہو گا ۔
میں ان باتوں کو مانتی نہیں پر . . .

جوتن کی ماں : بات یہ ہے کہ . . . یوگ کا باپ زندہ ہے !

ماں : (حیران ہوکر) سچ! میری سوگند لو!!
یوگ : میرا باپ کہاں سے آ گیا؟
جوتن کی ماں : تمہاری سوگند یوگ کی ماں! ـــــ یوگ کا باپ زندہ ہے!
ماں : ارے سچ سچ کہو۔ جوتن کی ماں۔ . . میں تو کانپنے لگی!
جوتن کی ماں : مجھے اپنے جوتن کی سوگند ـــــ زندہ ہیں۔ لڑائی کے شروع ہوتے ہی
وہ بدیس میں قید ہو گئے، یا نظر بند کر دیے گئے، کچھ ایسی ہی بات ہے ـــــ
یوگ : تمہیں کوئی چٹھی ملی ہے جوتن کی ماں؟
جوتن کی ماں : وہ خود جو مل گئے تو چٹھی کی کیا ضرورت ہے۔
ماں : ـــــ دیکھو ـــــ مذاق نہ کرو کرشنا۔ میں بیہوش ہو جاؤں گی۔
یہ ہاتھ رکھو ادھر، دیکھو ـــــ میرا دل کیسے دھڑک رہا ہے . . . . .
جوتن کی ماں : آئے ہائے تمہارا کیا خیال ہے میں یوں ہی جوتن کی سوگند لیتی پھرتی ہوں۔
یہ آج میرے پاس دھرا ہے۔ اس پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہوں، یوگ کے پتا آئے
ہوئے ہیں اور وہ شری پت پہلے شری پت نہیں رہے۔ بہت بدل گئے ہیں۔
ـــــ انھوں نے بہت دولت کمائی ہے۔
یوگ : نہیں جوتن کی ماں ـــــ میرے پتا جی؟ چھ سات برس کے بعد؟ نہیں
یہ سب مذاق ہو رہا ہے۔
ماں : ارے ٹھہرو تو (جوتن کی ماں سے) وہ ہیں کہاں؟
جوتن کی ماں : وہ صبح سے میرے گھر ٹھہرے ہوئے ہیں۔
ماں : تمہارے گھر ـــــ؟ تمہارے گھر کیوں؟ تم نے جان بوجھ کر انھیں
ادھر نہیں آنے دیا ہوگا . . . . میں جانتی ہوں، کیوں؟
جوتن کی ماں : کیوں؟ میرے گھر کیا ہے؟ تمہارا گھر بھی کوئی ٹھہرنے کی جگہ ہے

میرے ہاں میز ہیں، کرسیاں ہیں، شیشے ہیں۔ پلنگ ہیں اور ہر قسم کا سامان ہے جو ایک اچھے گھر میں ہونا چاہیے۔ انھوں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ اچھی سے اچھی جگہ دیکھی ہے۔ اُن کے اتارنے کے لیے بھی کوئی اچھی جگہ ہونی چاہیے۔

ماں : ـــ چلو ـــ میں تمھارے ساتھ چلتی ہوں ـــ نہیں میں کانپ رہی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ یوگ بیٹا! یہ بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ شاید اس کا کیا نتیجہ نکلے؟ (جوتن کی ماں سے) تو وہ تمھارے ہاں صبح سے آئے ہوئے ہیں یہ ٹھیک ہے، وہ اچھا گھر ہے لیکن یہ بھی کوئی بات ہے کہ بلا پنچھی آسمان بھر میں اُڑتا پھرتا ہے، وہ زمین پر اپنے گھاس پھوس کے گھونسلے کو نہیں بھول جاتا۔

(وقفہ ـــ پھر یوگ سے)

یوگ : بیٹا ـــ تم اپنے پتا کو لے آؤ۔

جوتن کی ماں : تم کیوں نہیں اُدھر چلی جاتیں۔ وہ آکر بیٹھیں گے کہاں؟

ماں : جہاں کہیں بیٹھیں انھیں پہلے اپنوں سے ملنے کے لیے آنا چاہیے تھا۔

جوتن کی ماں : میں نے اپنے ہاں اُتار لیا تو اس میں گناہ کیا ہوا؟ میں سمجھتی ہوں میں نے اچھا کام کیا۔

ماں : گناہ کوئی نہیں جوتن کی ماں ـــ لیکن تم کسی سے بھی پوچھو سب کہیں گے کہ اُسے پہلے اپنوں سے ملنے کے لیے آنا چاہیے تھا۔ اور پھر۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جوتن کی ماں : ہونہہ! ایک تم بھی اس کے اپنوں میں سے ہو گئیں!

ماں : (صدمہ زدہ) ہاں! میں اس کے اپنوں میں نہیں لیکن یوگ تو ہے! ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے یوگ کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کیا ہے، میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

یوگ : ماں میں انھیں جاکر لے آتا ہوں۔
جوتن کی ماں : انھیں وہیں رہنے دو۔ یوگ بیٹا! ـــــ اپنی ماں کو لے جاؤ۔
ماں : نہیں میں نہیں جاؤں گی ـــــ میں ان کی کون ہوتی ہوں؟ انھیں میری عزت کے لیے یہاں آنا چاہیے۔ میں ایک بڈھوا عورت ہوں۔ مجھے پرائے مردوں سے ملنے کے لیے ایسے نہیں چلے جانا چاہیے۔
یوگ : میں جاتا ہوں ـــــ لیکن مجھے بھی شرم آتی ہے۔ مجھے رونا آجائے گا۔
جوتن کی ماں : اس میں شرم کی کیا بات ہے؟
یوگ : نہیں نہیں ـــــ میں جاؤں گا (خوشی میں) میرے پتا جی آئے ہیں۔ میرے پتا جی۔ . . . .
(جاتا ہے اس کی آواز بڑی تیزی کے ساتھ دور ہٹتی جا رہی ہے)
جوتن کی ماں : ہاں تم کیا کہہ رہی تھیں بہن؟
ماں : یہی کہ پرائے مردوں سے ملنے کے لیے مجھے ایسے نہیں چلے جانا چاہیے۔
جوتن کی ماں : پرائے مرد تمھارے یہاں بے شک آجائیں؟
ماں : نہیں ـــــ وہ یوگ کے پتا ہیں اُن کے سوا اور کوئی نہیں آسکتا۔
جوتن کی ماں : جیسے تمھیں ان کے پاس جانے سے شرم آتی ہے، ایسے ہی انھیں بھی . . . . .
ماں : نہیں ہم دونوں کی بات ایک سی نہیں!
جوتن کی ماں : میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ تمھیں اُدھر چلے جانا چاہیے۔ وہ ایک پل میں اِدھر پہنچ جائیں گے۔ تب تک تمھارے ہاں صفائی بھی نہیں ہوئی ہوگی۔ یہ دیکھو سب کوڑا کباڑ۔ یہ دیکھو مشین ـــــ کپڑے اور کترن، اور یہ تصویریں، جیسے پنواڑیوں کی دکانوں پر ہوتی ہیں۔ اور یہ جنتری . . . . .
ماں : یہ ٹھیک ہے۔ لیکن یہ میرا گھر ہے . . . . .

جوتن کی ماں: تمہارا ابھی تک خیال ہے کہ میرے گھر جا کر شری پت رائے نے غلطی کی؟

ماں: ہاں ـــ مجھے اس بات کا گلہ ہے کہ تم انھیں سیدھے اِدھر کیوں نہیں لے آئیں؟ اور پھر صبح سے تم نے انھیں اپنے پاس کیوں رکھا ہے؟ بس یہ تو نہیں کہتی کہ اس میں تمہارا کوئی لالچ ہے لیکن یہ بات بنتی نہیں کہ تم......

جوتن کی ماں: میں نے بُرا کیا کیا؟ آتے ہی وہ نہائے، چاء پی۔ راستے کی مٹی آتاری تکان سے ان کی آنکھیں بھاری ہو رہی تھیں۔ اور وہ گرے پڑتے تھے اور پھر......

ماں: لیکن انھوں نے اپنے بیٹے اور پتنی کو یاد نہ کیا؟

جوتن کی ماں: کیا! وہ گھر میں پاؤں رکھنے سے پہلے روئے۔ لیکن اس بات کا خیال کر کے کہ کسی کا گھر ہے، وہ چپ رہے۔ میں نے کہا نا، انھوں نے بہت دُنیا دیکھی ہے، وہ اچھا بُرا سب سمجھتے ہیں۔

ماں: تم کہتی ہو اس نے اپنی پتنی کو یاد کیا۔ ایسے میں اپنی طبیعت پر کوئی کیسے قابو پا سکتا ہے؟...... (ٹھنڈی سانس لے کر) مرد ایسے ہی پتھر دل ہوتے ہیں ـــ!

جوتن کی ماں: انھوں نے اور بھی عورتیں دیکھی ہیں جن کے مقابلے اُن کی اَن پڑھ گنوار بیوی کچھ بھی نہ تھی!

ماں: چاہے، اَن پڑھ گنوار ہو کوئی، پھر بھی...... اور بیٹا!

جوتن کی ماں: بات دراصل یہ ہے کہ بیوی کے مر جانے کا انھیں بلبس ہی میں پتا چل گیا تھا ـــ اور بتانے والے نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ تمہارا بیٹا بھی چل بسا ہے، حالانکہ وہ جیتا تھا۔ سو جو اصل رونا دھونا تھا، وہ شری پت رائے پہلے ہی رو دھو چکے تھے۔

ماں : تو پھر وہ اپنے قصبے میں کیوں آئے ؟
جونن کی ماں : کوئی مرتھئی سمادھ پہ کیوں جاتا ہے ؟ ــــــ اور پھر اپنے دہین کی یاد ....
ماں : میرا دل ابھی تک کانپ رہا ہے !
جونن کی ماں : تمھارا دل بھلا کیوں کانپ رہا ہے ؟ شاید تم سمجھتی ہو کہ وہ ....
ماں : کیا سمجھتی ہوں ؟ .....
جونن کی ماں : (رک رک کر ہکلا کر) شاید تم سمجھتی ہو کہ وہ (گویا بات پلٹ جاتی ہے) ......
وہ .... یوگ کو لے جائیں گے !
ماں : نہیں نہیں ــــــ اس بات کی مجھے تسلی ہے ــــــ وہ یوگ کو نہیں لے جا سکتے دنیا میں اتنی اندھیر گردی نہیں۔ وہ تو اپنی طرف سے یوگ کو مار چکے تھے۔ اور اگر میں یوگ کو لے کر نہ پال لیتی تو نہ جانے اس کا کیا ہوتا ؟ .... میں نے سات آٹھ سال مصیبتیں سہہ کر یوگ کو پالا ہے۔ بڑھایا ہے ... تمھیں یاد ہے جب اسے محرقہ بخار ہوا تھا ... جب اس کا بخار پہلی بار ٹوٹا تو اس نے سخت سی ناشپاتی کھالی۔ اور پھر وہ اکیس دن کے لیے بیمار ہو گیا۔ میں اس کے لیے راتوں جاگتی رہی ــــــ میں آدھی رات کے وقت ہری داس کی سمادھ پر ایک ٹانگ کھڑے ہو کر پرارتھنا کرتی رہی ــــــ میں۔
جونن کی ماں : تم نے یہ سب باتیں کہہ ڈالیں !
ماں : میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے غصہ آ رہا ہے۔ کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ یوگ کو لے جائے اس کے پتا یوگ کے اتنے پتا نہیں جتنی میں ــــــ میں یوگ کی ماں ہوں ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ یوگ کی میں کچھ نہ رہ جاؤں ؟ وہ سات سال کے بعد آئیں اور کسی اور کے ہاں ٹھہر جائیں ــــــ اور .... ؟

جوتن کی ماں : میں اُن کے لیے نئی نہ تھی۔ وہ پہلے بھی مجھے جانتے تھے . . . . . میں ایک بات پوچھتی ہوں اگر تمھیں یقین ہے کہ وہ لوگ کو نہیں لے جائیں گے تو پھر تمھارا دل کیوں کانپتا ہے ؟

ماں : ـــــ میں نہیں جانتی ـــــ میرا دل کیوں اتنا کانپ رہا ہے ؟

جوتن کی ماں : مثلاً ـــــ میرا دل نہیں کانپ رہا۔

ماں : تم پر کبھی کوئی مصیبت نہیں ٹوٹی۔ تم نے جیون میں سُکھ ہی سُکھ دیکھا ہے لیکن میں نے . . . . .

جوتن کی ماں : دوسرے کو یہی معلوم ہوتا ہے۔ لوگ کی ماں !

ماں : اچھا میں پوچھتی ہوں ـــــ وہ اپنے بیٹے کے جیتے ہونے کی بابت سن کر بھی تمھارے ہاں بیٹھے رہے۔ اور پھر جیسا کہ تم نے بتایا سو گئے ـــــ

جوتن کی ماں : میں کوئی اتنی مُورکھ تھوڑے ہی ہوں کہ ایک دم انھیں یہ بات بتا دیتی ایسے ہی میں تو دھکا لگ جاتا ہے۔ میں نے آہستہ آہستہ انھیں یہ خوشخبری سنائی۔

ماں : پھر وہ خوش ہوئے ؟

جوتن کی ماں : اور نہیں تو کیا، ارے میں کہتی ہوں، دیوانے ہو گئے۔ اس سے کہیں زیادہ دیوانے جتنے تم لوگ نظر آتے ہو۔

ماں : بات یہ ہے ہمیں ابھی تک یقین نہیں آ رہا ـــــ اچھا، اتنے خوش ہوئے !

جوتن کی ماں : بس اتنے ہی خوش جتنا اب تم ایکا ایکی ہو گئی ہو۔

ماں : میں خوش ہو گئی ہوں ـــــ اچھا ! تم نے میرا ذکر بھی کیا ؟

جوتن کی ماں : تمھارا ذکر ؟ . . . اوہ میں بھول ہی گئی۔ زیادہ نہیں تھوڑا بہت ضرور کیا ہو گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں بہت کام میں لگی رہی۔ پہلے

چائے بنائی۔ پھر ان کے نہانے کے لیے پانی گرم کیا۔ پھر انھوں نے کھانا کھایا۔ میں
بے سکار باتیں کرتی رہی۔ حالانکہ وہ سورہے تھے۔ پھر....

ماں : (افسوس سے) ارے! تم نے میرا نام کبھی نہ لیا؟

جوتن کی ماں: نام تو لیا تھا۔

ماں: یہ سب بے کار ہے۔ بے ہودہ ہے۔ اس میں تمھاری کوئی چال ہے ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی یوگ کا نام لے اور میرا نام نہ لے... بھلا تم نے ان کی اتنی خاطرداری کیوں کی؟

جوتن کی ماں: (برہم ہو کر) تم ناحق منہ کو آتی ہو یوگ کی ماں! تم اس سے پہلے اشارے اشارے میں اپنا حلیا دکھا چکی ہو۔ زیادہ باتیں بناؤ گی تو مجھ سا برا کوئی نہیں ہوگا۔

ماں: نہیں تم لاکھ کہو اس میں کوئی بھید ہے.... تمھارا کوئی حق نہ تھا کہ تم اسے اپنے گھر میں رکھو اور پھر صبح سے شام تک.... میں جانتی ہوں تم کس طرح کی عورت ہو......

جوتن کی ماں: بس.... اس سے زیادہ زبان چلائی تو سر کا ایک بال نہ چھوڑوں گی۔ کہے دیتی ہوں۔

ماں: اس سے پہلے تم نے میرے ساتھ کم برا سلوک کیا ہے؟ بدکاری آپ کرتی رہی ہو اور سر میرے تھوپتی رہی ہو۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا تو میرا بھگوان تو جانتا ہے۔

جوتن کی ماں: (فوراً ڈھل کر) یوگ کی ماں، آج تمھیں ہوا کیا ہے؟ تم تو ایسی نہ تھیں کبھی....

ماں: (بدستور ہسٹریا کے مریض کی طرح) ہاں میں ایسی نہ تھی لیکن تم نے مجھے ایسا

بنا دیا ہے۔۔۔۔ اگر تم نے یہی وطیرہ رکھا تو شاید مجھے اس سے بھی برا بننا پڑے۔ شریف انسان کو آزمانا نہیں چاہیے۔ وہ چپ رہتا ہے۔ لیکن جب وہ بولتا ہے تو۔۔۔۔۔ بہت بولتا ہے۔

جوتن کی ماں: خیال تو کرو۔۔۔۔ یوگ کی ماں! شری پت آتے ہی ہوں گے۔

ماں: میں کیا کروں۔ تم ہی نے یہ اول جلول کہلوائی ہے مجھ سے۔

(دروازے پر آہٹ۔۔۔ کوئی کھنکارتا ہے)

(ڈر کر) میں جانوں، وہ آ ہی گئے۔

جوتن کی ماں: تو اور کیا۔۔۔۔۔ دیکھو کیسے اٹھا رکھا ہے یوگ کو ــــ! وہ اتر رہا ہے!!

ماں: (گھبرا کر) اب کیا کروں؟۔۔۔ تمھارے اس کل کلیش نے چار پائی سے کپڑے بھی اٹھانے نہیں دیے۔

یوگ: (بھاگ کر آتا ہے) ماں۔۔۔ پتا جی۔۔۔۔ پتا جی۔۔۔ ماں ــــ!

شری پت رائے: (شرماتے ہوئے) نمستے۔

ماں: (جھجکتے ہوئے)۔۔۔ ن۔۔۔ ن ــــ نمستے۔۔۔ آئیے۔۔۔۔۔۔۔ آ۔۔۔ آ۔۔۔۔ بیٹھیے!

شری پت: کوئی بات نہیں۔ آپ بیٹھیے۔۔۔ میں اپنے آپ بیٹھ جاؤں گا۔۔۔۔ اس تپائی۔۔۔۔۔

جوتن کی ماں: آپ ہی کا ذکر کیا تھا میں نے۔۔۔ انھوں نے یوگ کو پالا اور پڑھایا۔۔۔ اب یوگ اس طرح پشو بنا رہتا ہے تو ان کا کیا قصور؟ گھر میں کوئی کمانے والا نہیں۔ سلائی پر ان کی گزر ہوتی ہے۔ یہ بھی شکر ہے بھگوان کا محلے والے پرماتما سے ڈرتے ہیں اور۔۔۔۔۔

ماں : جوتن کی ماں . . . . . . !

جوتن کی ماں : کیا بات ہے . . . . رک کیوں گئیں . . . . ؟

ماں : (گھبرا کر) انھیں بیٹھنے تو دے . . . پھر باتیں ہولیں گی . . . یوگ . . . . یوگ بیٹا! بات سن . . . .

یوگ : کیا ہے ؟

ماں : (کان میں) جا بازار سے چار کی پتّی تو لے آ۔ پیسے اس دھوتی کے پلّو سے کھول لے۔

جوتن کی ماں : (ہنس کر) تم چائے کی پتّی کبھی نہیں رکھتیں۔

شری پت : نہیں۔ میں ابھی چائے نہیں پیوں گا . . . آپ تکلیف نہ کیجیے . . . . جی میں چائے . . . .

ماں : (کھسیانی ہوکر) ختم ہو گئی . . . . چیز ختم کبھی تو ہو جاتی ہے۔

جوتن کی ماں : (نصیحت کرتے ہوئے) ایک بڑا پیکٹ منگوالیا کرو نا۔ کہو تو میں بھیج دوں ؟

ماں : نہیں کرشنا! یوگ اپنے آپ لے آئے گا اسے بھی تو ماں باپ کی خدمت کا موقع دینا چاہیے۔

جوتن کی ماں : تو کونسا پیکٹ منگواؤ گی ؟

ماں : جو چائے کا پیکٹ ہوتا ہے . . . . چھوٹا پیکٹ!

جوتن کی ماں : چھوٹے پیکٹ میں تو بس خاک دھول ہوتی ہے میرے پاس ہرے لیبل کی چائے ہے۔

شری پت : میں کہہ رہا ہوں ابھی مجھے ضرورت نہیں ہے۔ البتہ ٹھہر کر چائے پی لوں گا۔ باہر جا کر مجھے چائے پینے کی عادت ضرور ہو گئی ہے لیکن . . . . .

جوتن کی ماں : تم سب شام کو کھانا ہمارے ہاں کھانا . . . یوگ کی ماں !

ماں : نہیں بھائی ـــــ جیسا روکھا سوکھا ہوگا میں کھلاؤں گی لیکن کسی کے گھر نہیں کھانے دوں گی ..... بھگوان نے وُدُر کا ساگ سویکار کیا تھا ـــــ ۔

شری پت : آپ نہیں جانتیں جنگ میں ہم کیا کچھ کھاتے رہے ہیں ؟ بیس بیس دن ٹرنچوں میں پڑے سوکھی زمین کو ترس جاتے تھے ۔ یہاں لوگ سمجھتے ہیں ہرے لیبل کے بغیر چائے ہی نہیں پی جاسکتی .....

ماں : یوگ بیٹا ..... جا پھر چائے لے آ ۔

شری پت : یوگ کو میرے پاس رہنے دیجیے اور چائے جوتن کے ہاں سے منگوا لیجیے ۔

ماں : اس کی کیا ضرورت ہے ..... میں خود .....

جوتن کی ماں : آئے ہائے ..... اتنا ہی وہ ہے تو میں تم سے قیمت لے لوں گی ـــ چائے تو اچھی پلا دینا ۔

ماں : (غصّے کو دباتے ہوئے) اچھا تو یوگ ان کے پاس رہے گا ۔ تم آپ جاؤ اور کچھ پتی بھیج دو ۔

جوتن کی ماں : (گھبرا کر) میں ..... میں (سنبھل کر) اچھّا میں جا کر بھجواتی ہوں لیکن شام کا کھانا ......

شری پت : نہیں آپ تکلیف نہ فرمائیے ۔ میں نے صبح کا کھانا جو آپ کے ہاں کھا لیا ۔ اب شام کو ان کے ہاں سہی ۔

جوتن کی ماں : (جاتے ہوئے) اچھّا ..... اچھا ..... تو میں تھوڑا کسٹرڈ پوڈر بھیج دوں ؟

ماں : نہیں اور کسی چیز کی ضرورت نہیں ۔

یوگ : میں پتا جی کے لیے سب کچھ بازار سے لے آؤں گا ۔

شری پت : نہیں مجھے کچھ نہیں چاہیے ، میرے بیٹے ۔ آج تم سے مل کر میں نے سب

کچھ پا لیا ہے۔ میں سب کچھ کھو چکا تھا۔ میرے پاس چند سکوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ لیکن یہ سکے سب کھوٹے تھے۔ آج میں نے رتن، مانک، جواہر سبھی کچھ پا لیا ہے آج میرے کھوٹے بھی کھرے ہو گئے۔

ماں: (آنکھیں پونچھتے ہوئے) آپ کو لوگ کا پتا نہ تھا؟

شری پت: کہاں؟ —— میں سمجھتا تھا، اس سنسار میں میرا کوئی نہیں رہا میں تو اس وچار کے ساتھ آیا تھا کہ اپنا دیس ہے چلو دیکھ آؤں، اور اپنے پیاروں کی سمادھی پر دو پھول دھر جاتا ہے)۔۔۔۔ (وقفہ) اچھا ہوا میں ادھر آ گیا۔ ورنہ میرا ارادہ تھا کہ وہیں ہلڈانگ میں رہ جاؤں سیام میں میرا کالی مرچ اور لونگ کا اجارہ ہے۔

لوگ: کالی مرچ سے بھی کوئی آمدنی ہوتی ہے پتا جی؟ یہاں رتّو وہی تو بیوپار کرتا ہے لیکن...

شری پت: میں اجارہ کہہ رہا ہوں بیٹا ——!

لوگ: ماں یہ اجارہ کیا ہوتا ہے؟

شری پت: تم اُن سے کیوں پوچھتے ہو۔ بات میں نے کی ہے نہ کہ تمھاری..... تمھاری ماں نے....

ماں: (شرماتے ہوئے) میں کیا جانوں —— یہ اجارہ کیا بلا ہوتی ہے؟

شری پت: اجارہ ہوتا ہے..... حکومت سے ایک چیز کا اجارہ لے لینا! میرا مطلب ہے..... یعنی میرے سوا سارے ملک سیام میں کوئی لونگ اور کالی مرچ نہیں لا سکتا اور نہ بیچ سکتا ہے۔

ماں: تھوک مال بیچتے ہوں گے نا!

لوگ: ہاں ہمارے شہر میں کئی دکانوں پہ بورڈ لگے ہیں۔ مثلاً ایک پہ شیخ رحمت اللہ تھوک فروش۔ پہلے ہم تھوک فروش کا کوئی اور ہی مطلب

سمجھتے تھے ـــــــ۔

شری پت: نہیں تھوک فروش نہیں ..... مثلاً کالی مرچ اور لونگ کا تھوک فروش تو وہ ہوتا ہے جو پرچون نہیں بیچتا ـــــــ پرچون کا مطلب ہے پیسے پیسے اور ٹکے ٹکے کی چیز۔

یوگ: میں ملٹرانگ جاؤں گا ـــــــ پتاجی ....

شری پت: ـــــــ بیٹا ـــــــ دنیا بھر میں جس جگہ ہیں جاؤں گا تمھیں لے جاؤں گا۔

ماں: لیکن پڑھائی کا کیا کروگے؟ ـــــــ اور تمھاری ریلی کا کیا بنے گا؟

یوگ: پتاجی ـــ پتاجی ـــــــ میں اپنے اسکول میں اسکاؤٹ ہوں، کل ہماری ریلی ہے جس میں چیف جسٹس آئے ہیں وہاں ہمیں انعام بھی ملیں گے مجھے اس کے لیے رومال چاہیے اور مجھے حساب کی ایک کتاب خریدنا ہے۔

شری پت: بیٹا، ایک رومال چھوڑ بیس تمھیں بیس رومال لے دوں گا۔ کل تم میرے ساتھ جانا۔ میں تمھیں بہت سی اچھی اچھی کتابیں خرید دوں گا! بیٹا! پڑھائی ایسی کوئی دولت نہیں۔ تمھیں ان کا احسان مند ہونا چاہیے جنھوں نے اتنی تکلیفیں سہ کر تمھیں علم کی روشنی دلوائی۔ تمھاری ماں مرچکی تھی ..... لیکن ..... (رک جاتا ہے)

ماں: وہ بیچاری جیتی ہوتی تو آج اپنے لال کو دیکھتی (رک جاتی ہے) اس کے بعد میں نے ماں بننے کا جتن کیا ..... اور ..... اور ..... اب بھی کروں گی۔

یوگ: جو کچھ ماں نے میرے لیے کیا پتاجی وہ میں جانتا ہوں یا میرا پرماتما!

شری پت: (ہنس کر) ارے یوگ بیٹا تو بہت عقلمندوں کی سی باتیں کرنے لگا ہے ..... (اسے چومتا ہے) ارے ایسے گھبراتے کیوں ہو؟ ٹھہرو مجھے اپنے گال کے

ساتھ گال رگڑنے دو۔

یوگ: (جیسے پرے ہٹ رہا ہے) نہیں پتاجی! مجھے بہت کُھردرے معلوم ہوتے ہیں۔

(ہنستے ہیں)

ماں: یوگ کے آنے سے پہلے میرے دن پہاڑ برابر ہو رہے تھے چلنا بھی کام کرو۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ایک پل میں ختم ہو گیا اور اس کے بعد دن۔۔۔۔ یوں پتا چلتا تھا جیسے کوئی بہت بڑا اجگر منہ پھاڑے آ رہا ہے۔۔۔۔۔ جو نہ کھاتا ہے اور نہ چھوڑتا ہے۔۔۔ پھر یوگ آیا تو کام ہی کام نظر آنے لگا جیسے اُدھڑے ہوئے۔۔۔۔ گچھے میں سے تار نکلتا ہی چلا آتا ہے۔۔۔۔

شری پت: میں آپ کا بہت احسان مند ہوں۔ شاید میں پورے طور سے اس کا بدلہ نہ چکا سکوں۔

ماں: (شک میں پڑتے ہوئے) آپ اس کا بدلہ کیوں چکائیں گے؟۔۔۔ یوگ جیسے آپ کا بیٹا ہے ویسا ہی میرا۔

شری پت: ۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں آپ کا احسان کبھی نہیں اُتار سکتا۔

(دروازے پہ دستک سنائی دیتی ہے)

ماں: اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں آپ سے؟ —— پھر مجھے چائے بنانا ہے۔ بیٹی آ گئی شاید۔۔۔۔۔

شری پت: بڑے شوق سے پوچھیے ——

ماں: آپ جوتن کے ہاں کیسے چلے گئے؟

شری پت: یونہی!۔۔۔۔ اور کہاں جاتا؟

ماں: آپ کو پتا نہیں تھا کہ یوگ یہاں رہتا ہے؟

شری پت: یوگ کے ہونے کا مجھے ابھی پتا چلا ہے۔

ماں : آپ نے کسی سے نہ پوچھا ؟

شری پت : صرف جوتن کی ماں سے پوچھا تھا۔ اس نے کچھ اس طریقے سے جواب دیا کہ میں نے پہلی اطلاعوں کو درست سمجھ لیا۔ اب پرماتما کا شکر ہے کہ....

ماں : آپ جوتن کے گھر والوں کو پہلے سے جانتے تھے ؟

شری پت : ہاں جانتا تھا ــــــ جوتن کی ماں کو جانتا تھا۔ یہ آج سے دس سال پہلے بھی ایسی تھی جیسے آج ہے۔ دراصل کئی عورتیں بوڑھی ہی نہیں ہوتیں۔ بلڈنگ میں ایسی ہی ایک عورت ہے تھئی (THEI) نام کی۔ جیسے اس کے لکڑی کے مکان کی بیل پر ہمیشہ بہار رہتی ہے، ویسے ہی اس پر.....

ماں : جوتن کی ماں آج سے دس سال پہلے بھی ایسی ہی "آزاد" تھی۔

شری پت : ہاں..... بالکل ایسی ہی۔

ماں : گویا آپ کو پتا تھا یہ ایسی عورت ہے تو پھر اس کے مکان پر.....

شری پت : بات دراصل یہ ہے.....

یوگ : ماں ! پھر بازار بند ہو جائے گا، مجھے چیزیں خریدنا ہیں۔

ماں : لو، تم پیسے لو اور بازار چلے جاؤ ــــــ

شری پت : ابھی یوگ کو رہنے دیجیے.....

ماں : کچھ کھانے کو بھی لیتا آئے گا۔

شری پت : میں نے کہا نا مجھے کچھ ایسی بھوک بھی نہیں ہے۔ باقی رہی دوسری چیزیں تو کل صبح میں آپ ساتھ جا کر ریلی کے وقت سے پہلے خرید دوں گا۔ کل اتوار تو نہیں ؟

ماں : نہیں کل سنیچر ہے۔

شری پت : اچھا یہ کام ختم کر آتے تو اچھا ہے۔ میرا مطلب تھا کہ اتنی دیر کے بعد ملے ہیں تو ذرا پیار محبت کی ہی باتیں ہو جائیں۔ لیکن ساری رات پڑی ہے اس کے لیے۔
ماں : تو اچھا۔۔۔۔۔ نہیں اسے نہ جانے دیجیے۔۔۔ میرے خیال میں لوگ کو نہیں رہنا چاہیے۔
شری پت : یہ تو میں نے پہلے کہا تھا۔
ماں : آپ نے ٹھیک کہا تھا۔
شری پت : آپ خفا تو نہیں ہو گئیں ــــــــ ؟
ماں : میں کیوں خفا ہونے لگی ــــــ ؟ اُلٹا مجھے خیال ہے کہیں آپ۔۔۔۔ ؟
شری پت : نہیں میں ایسا آدمی نہیں ہوں۔ مجھ پر جو آدمی الزام لگائے مجھے اس پر رحم آتا ہے۔ وہ ضرور کسی نہ کسی حسد اور بغض کا شکار ہوتا ہے۔
ماں : آپ کا مطلب ہے میں نے کرشنا کی بابت جو پوچھا ہے تو۔۔۔۔۔
شری پت : نہیں نہیں ــــــــ میرا کسی خاص بات کی طرف اشارا نہیں۔ میں ان کے ہاں ٹھہر سکتا تھا۔ یہ بُری شہرت والے گھر ہی ہیں، جہاں مجھ ایسے آدمی کو پناہ مل سکتی ہے۔
ماں : مجھ ایسے کیوں کہا آپ نے ؟
شری پت : ہاں بابا !! ایک آدمی جس کے کوئی عورت نہ ہو۔ اور محلّے بھر میں جس کی واقفیت نہ ہو اور کون ٹھہرنے کے لیے جگہ دیتا ہے ؟
ماں : آپ میرے ہاں بے کھٹکے آ سکتے تھے۔
شری پت : میں نے پہلے عرض کیا نا کہ مجھے لوگ کی بابت پتا نہیں تھا اور دوسرے یہ کہ۔۔۔۔۔۔ مثلاً مجھے اب بھی کھٹکا ہے۔۔۔۔۔۔
ماں : آپ کو کس بات کا کھٹکا ہے ؟

شری پت : نہیں اپنی ذات کی فکر نہیں — مجھے آپ کا خیال ہے۔
ماں : نہیں اس بات کا خیال نہ کیجیے۔ لوگ نہیں جانتے کہ آپ لوگ کے پتا ہیں اور میں اس کی ماں . . . . ؟

شری پت : یہی بات تو آپ کے لیے مفید نہیں۔
ماں : لیکن وہ جانتے ہیں ہیں اُس کی . . . اس کی . . . سگی ماں نہیں —
شری پت : سگی ماں ہوتیں تو مجھے ڈر کاہے کا تھا ؟
ماں : اوہ ! (وقفہ) ٹھہریے ! میں آپ کے لیے چائے بناؤں . . . آپ ہلکی پیتے ہیں . . . یا . . . سخت . . .

شری پت : تیز۔
ماں : تیز ؟ . . . اچھا . . . اچھا . . . (جاتی ہے)
شری پت : لوگ بیٹا ! کہو کیا حال ہے ؟ میں نے پچھلے چھ سات سال میں بہت دکھ سہے بیٹا ! تمھیں اپنی ماں کی شکل یاد ہے ؟
لوگ : ہاں پتاجی۔ یونہی تھوڑی تھوڑی۔ اب جو یاد کرتا ہوں تو کبھی ان کی شکل سامنے آجاتی ہے اور کبھی نہیں اور اُن کی شکل ان کی شکل میں گھل مل جاتی ہے !

شری پت : تمھیں اپنی یہ ماں پسند ہے ؟
لوگ : مائیں بھی پسند کی جاتی ہیں بھلا — ؟ ماں تو ایک ہی ہوتی ہے کیا الٹی گفتگو کر رہی ہو۔
شری پت : (گھبرا کر) ہاں ! ماں کے چننے کا اختیار کس کو ہے ؟ بیٹا ! تم تو بہت سیانی باتیں کرتے ہو۔ ادھر آؤ میرے پاس۔
لوگ : — — — — اوں ہوں !

شری پت : ارے گھبراتے کیوں ہو ؟
یوگ : آپ میرا مُنہ تو نہیں چومیں گے ؟
شری پت : باپ اپنے بیٹوں کا منہ چومتے ہیں ۔ اور جو باپ سات سال کے بعد اپنے بیٹے کو ملے اور پھر ایسے بیٹے کو جس کی بات سُن رکھا ہو کہ اس دُنیا ہی میں نہیں ۔
یوگ : لیکن میں بہت بڑا ہو گیا ہوں نا ؟
شری پت : ارے کتنے بڑے ہو گئے ہو ؟ (پکڑنے کی کوشش کرتا ہے) میرے لیے تو تم کچھ بھی نہیں ۔
یوگ : اوں ہوں ۔ ماں دیکھ رہی ہے ۔
شری پت : (ہنستے ہوئے) تو دیکھتی رہے ۔ وہ دُور بیٹھی ہے ۔ ارے سنو ۔ ماں جب باپ کو بیٹے کا مُنہ چومتے دیکھتی ہے تو وہ خوش ہوتی ہے ۔
یوگ : نہیں پتا جی ۔ ماں شرما رہی ہے ۔ اس کے کان اِدھر ہی ہیں ۔
شری پت : وہ تو آگ کے پاس بیٹھنے سے اس کا چہرہ لال ہے ۔ اچھا میری بات سنو .... تمھاری ماں کو میں جانتا ہوں ۔ اُن دنوں میں باہر گیا تھا ——— جب یہ بیاہ کر آئی تھیں ۔ بدقسمت بیچاری ! ——— ابھی عمر ہی کیا ہے تیس بتیس برس کی ہوں گی ۔
یوگ : ہاں یہی عمر ہے ۔
شری پت : جو تن کی ماں سے بہت چھوٹی ہیں ——— اور یوں بھی .....
یوگ : جو تن کی ماں کا نام نہ لیجیے ۔ اس کا نام لینا گناہ ہے ۔
شری پت : لیکن وہ ہر انداز سے .... خیر چھوڑو ۔ تم اسے ماں بنانا پسند کرتے ہو ؟

یوگ : ماں تو ہیں ہی ۔ بتانے کی کیا بات ہے ؟
شری پت :۔ نہیں بیٹا! شاید تمھیں . . . . .

(ماں چائے لے کر آجاتی ہے)

یوگ : میں کہتا ہوں پتاجی ——— ماں چائے لے آئیں۔
ماں : آپ ذرا کوٹ ووٹ اُتار کر بیٹھ جائیے ، مجھے دید یجیے۔ کوئی دھوتی ووتی دے دوں ؟

(وقفہ ـــ جس میں دھوتی تلاش کرتی ہے)
آپ اُدھر جاکر کپڑے تبدیل کر لیجیے ۔ اور ذرا آرام سے ۔
شری پت : نہیں دھوتی ووتی کی ضرورت نہیں پڑے گی ۔ ہم وہاں ایمرجنسی میں کپڑوں سمیت سونے کے عادی ہو چکے ہیں ۔ البتہ مجھے غسل خانہ بتا دیجیے کدھر ہے۔ میں چائے پینے سے پہلے . . . .
ماں : وہ رہا برآمدے اور چھجے کے درمیان ——— وہ نالی کے ساتھ ۔
شری پت : یہ لیجیے میرا کوٹ ۔
ماں : آپ نے کوٹ کے نیچے صرف بنیان ہی پہن رکھی ہے ۔
شری پت : دراصل یہ ملٹری کے انداز میں سلا ہوا ہے ۔ اسے کوٹ نہیں کہتے ——— (جاتے ہوئے) سامنے جیب میں پیسے ہیں ذرا ۔
ماں : بے فکر رہیے، یہاں میرے اور یوگ کے سوا اور کون آتا ہے ۔ (یوگ سے) تم مجھے چھوڑ تو نہیں جاؤ گے بیٹا ؟
یوگ : نہیں چھوڑ جاؤں گا ماں ——— اُلٹا تم ہی مجھے اُن کے حوالے نہ کر دینا ۔
ماں : نہیں میرے لال ۔ تمھیں میرے ہاں سے کون لے جا سکتا ہے ۔ وہ کیا پوچھ رہے تھے . . . . ؟

یوگ : کہہ رہے تھے، میں جانتا ہوں تمہاری ماں کو۔ جن دِنوں مَیں گیا تھا۔ ابھی دنوں بیاہ کر آئی تھیں۔ بدقسمت بیچاری ؟

ماں : اچھا ؟ مجھ پر ترس کھاتے ہیں۔ بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ ... لیکن جب میں بیاہ کر آئی تھی، تو میں نے انھیں نہیں دیکھا ——— ہاں تھوڑا بہت دیکھا تھا ... اور کیا کہتے تھے ؟

یوگ : کہتے تھے ابھی عمر ہی کیا ہے۔ یہی تیس بتّیس برس کی ہوگی۔ میں نے کہا ہاں یہی عمر ہے۔

ماں : اچھا! عمر بھی پوچھی تھی ——— اور تم نے کہا اکتیس بتیس برس کی ہوگی ؟

یوگ : ہاں تو اور کیا۔

ماں : ارے کہاں بیٹا۔ میں دکھوں مصیبتوں کی وجہ سے اس عمر کی نظر آتی ہوں ورنہ میری عمر ستائیس سال کی ہے، خیر۔

یوگ : کہہ رہے تھے جونتی کی ماں سے بہت چھوٹی ہیں ——— اور یوں بھی..

ماں : ——— یوں بھی ... ؟

یوگ : اس کے بعد چُپ ہو گئے۔

ماں : اچھا میں سمجھ گئی ——— جونتی کی ماں چالیس برس سے کم کی کیا ہوگی۔ اور پھر محلّے کے لوگ اسے جس طرح جانتے ہیں تمہیں پتا ہی ہے۔

یوگ : ہاں ماں! مجھ سے کیا چھپا ہوا ہے

ماں : تو اور بات بھی پوچھی ہوگی ؟

[illegible]

[illegible]

اور تمھارے پتا گھر آگئے . . . . میں تو یہ چاہتی ہوں کہ تمھیں کہیں ولیسے ہی
بدیس بھیج دیں . . . . اور اگر تم جاؤ تو تمھارے ساتھ میں بھی جاؤں گی
. . . . میں اب اکیلی نہیں رہ سکتی۔ کسی نردئی کو میرا خیال نہیں آتا . . . .
میرے دیور، توں میرے نام کی مالا جپتے ہیں۔ وہی تمھارے چچا جو آج کل دیش
کے آگو بنے ہوئے ہیں جنھوں نے سڑک کی بتیوں کی روشنی میں ودیا حاصل
کی۔ کہتے ہیں۔ گھر کی لاج رکھے بیٹھی ہے اور یوں میرے پہننے کے لیے ایک
چیتھڑا تک دینے کو تیار نہیں۔ میں اس جھوٹی لاج کو کیا کروں . . . . ؟
اس مہنگائی میں جو مجھ غریب کا حال ہوا ہے وہ اچھی طرح سے جانتے ہیں ــــ
لیکن اب مجھ سے خالی خولی تعریف نہیں سنی جاتی۔

لوگ: ماں، تم بہت اونچی آواز میں بولنے لگی ہو اور تمھاری آنکھوں میں . . . .

ماں: نہیں . . . . نہیں . . . .

لوگ: نہیں ماں، اب ہمارے اچھے دن آ رہے ہیں۔

ماں: ہاں بھگوان بُری نظر سے بچائے . . . . اڑوس پڑوس نے پہلے ہی جلنا شروع
کر دیا ہے۔

لوگ: وہ جوتن کی ماں ــــــ بڑی فضول عورت ہے . . . . !

ماں: دیکھو تمھارے پتا کتنے مضبوط آدمی ہیں! تمھیں بھی ان ایسا بننا چاہیے بیٹا،
لیکن تم ہو کہ دودھ دہی کو منہ نہیں لگاتے اور تلی ہوئی دال کو پسند
کیے جاتے ہو . . . . دیکھو ان کے بازو . . . . ان میں کیسی مچھلیاں سی نظر
آتی ہیں۔ اور کتنا . . . .

لوگ: کیا پتا جی میری عمر میں مجھ ایسے ڈھیلے پتلے ہوں ــــ ماں! پتا جی کی
چھاتی پر اتنے بال کیوں ہیں؟

ماں : مردوں کے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جب تم جوان ہوگے تو تمھاری چھاتی پر بھی بہت سے بال ہوں گے۔ لو وہ آگئے۔

شری پت : (قریب آتے ہوئے) آپ نے چائے پینی شروع کر دی ہوتی۔

ماں : آپ کے بغیر ہی ؟

شری پت : اوہ ـــــ اور یہ سموسے آپ نے کہاں سے منگوائے ..... بڑے اچھے ہیں۔ یہ چوپڑتی سموسے .....

ماں : صبح یوگ اسکول جاتا ہے نا ـــــ اس کے لیے منگوا رکھے تھے ... میں کہتی ہوں۔ آپ لیٹ جائیے۔ ابھی آپ بہت تھکے ہوئے نظر آتے ہیں آپ کا بیٹا آپ کے پانو دبا دے گا، کیوں بیٹا ؟

یوگ : ہاں پتاجی ؛ آپ لیٹ جائیے۔ میں آپ کے پانو دبا دوں گا۔

(کھاتے ہوئے)

شری پت : نہیں بیٹا۔ مجھے عادت نہیں ..... نہیں نہیں .... اچھا ... میں اس تپائی پہ بیٹھتا ہوں۔ دیکھیں تو میرے بیٹے میں کتنا زور ہے۔

(یوگ دباتا ہے)

ارے آہستہ! تم تو بڑے شہزور نکلے۔

(ماں پیالی پیش کرتی ہے)

ماں : لیجیے ـــــ یہ پیالی۔

شری پت : اور آپ۔

ماں : میں آپ کے لیے بستر لگا دوں۔

شری پت : نہیں ابھی بہت وقت ہے۔ میں شاید یہاں سو نہ سکوں۔

ماں : آپ یہاں نہ سو سکیں ؟ ـــــ کیوں ؟ ..... اور کہاں جائیں گے آپ؟

شری پت : دیکھیے نا ؟ یہ کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ۔ ۔ ۔ آپ سب کچھ سمجھتی بوجھتی ہیں۔

ماں : لیکن اس میں ہرج کیا ہے ؟ کوئی کچھ نہیں کہے گا۔

شری پت : یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی۔

ماں : نہیں آپ یہیں آرام کیجیے۔ میں آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گی میں خود پچھواڑے چلی جاؤں گی۔ وہاں میری ایک سہیلی رہتی ہے۔ اس کا مرد باہر گیا ہوا ہے۔

شری پت : نہیں میں آپ کو ایسی تکلیف نہیں دوں گا۔ میں اس وقت کہیں رات کاٹ لوں گا۔ پھر کل دن کو یہاں آجاؤں گا۔ پھر سارا دن آپ کے پاس رہوں گا۔

ماں : آپ جائیں گے کہاں ؟

یوگ : کیا آپ جوتن کے ہاں جائیں گے ؟

شری پت : ارے نہیں بیٹا ! میں یہاں کسی ہوٹل ووٹل میں رات کاٹ لوں گا۔ پھر قریب کے محلے میں میرا ایک دوست بھی رہتا ہے !

ماں : نہیں ! میں آپ کو باہر نہ جانے دوں گی خواہ مجھے خود کہیں جانا پڑے۔ دیکھیے ہمارا دل نہ توڑیے۔ یوگ کیا کہے گا۔ اس معصوم بچے کے دل پہ کیا گزرے گی ؟ کیا دنیا میں ہر جگہ پاپ اپرادھ ہی ہوتا ہے ؟ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک مرد اور ایک عورت ایک چھت کے تلے سو سکیں، اور ان کے نام پر کوئی دھبہ نہ آئے ؟

شری پت : ابھی تک دنیا والے اتنے بڑے دل والے نہیں ہوئے۔ اور پھر اگر آپ اجازت دیں تو ایک رات کے لیے میں یوگ کو ساتھ لیتا جاؤں۔

ماں : اور میں یہاں اکیلی رہ جاؤں ؟ . . . . .

شری پت : (سوچتے ہوئے) اچھا ! یہ نہیں ہوسکتا۔ لیکن یوگ کے بنا مجھے کبھی نیند نہیں آئے گی۔ آج آٹھ سال کے بعد میں اپنے بیٹے سے ملا ہوں۔ آپ نہیں جانتیں کہ میں آپ کا کتنا احسان مند ہوں۔ مجھے شبد نہیں ملتے جن سے میں آپ کی تعریف کروں۔ میں اتنا بڑا قرض نہیں اُتار سکتا۔

ماں : لیکن یوگ کے بغیر میں بھی نہیں رہ سکتی۔ آپ نے اپنی طرف سے یوگ کو . . . . آپ سمجھتے تھے یوگ اس سنسار میں نہیں ہے۔ میں نے اُسے لے کر پالا۔ اب آپ اسے ایک رات کے لیے بھی نہیں لے جا سکتے . . . . مجھے کچھ وشواس نہیں آتا۔ ہائے، میں کیا کروں۔ میں بہت گھبرا رہی ہوں۔

شری پت : اچھا، اس بات کا اس کے سوا اور کوئی علاج نہیں کہ میں یہیں رہ جاؤں صرف —— صرف مجھے آپ کی عزت کا خیال ہے . . . . .

ماں : نہیں۔ میری طرف سے آپ کو یہ آگیہ ہے کہ آپ باہر سو جائیں لیکن بھگوان کے لیے یوگ کو نہ لے جائیے۔ میرا حوصلہ نہیں پڑتا۔ اور اگر آپ یہاں سونے کے لیے تیار ہیں تو یہ سمجھ لیجیے کہ مجھے اپنی عزت کا زیادہ خیال ہے۔

شری پت : اچھا، لیکن مجھے آپ سے ایک بات اور کرنا ہے۔

ماں : کہیے —— کس بارے میں، آپ . . . .

شری پت : یہی۔ یوگ کے بارے میں۔

ماں : (گھبرا کر) یوگ کے بارے میں۔ آپ کیا چاہتے ہیں ؟

شری پت : یہی کہ —— یوگ کو میں لے جانا چاہتا ہوں۔ میں آپ کا دھنوادی ہوں۔ آپ تو خدمت کہیں ہیں کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن اب یہ میرا بیٹا ہے۔

ماں : نہیں ! نہیں ! ! —— یوگ میرا بیٹا ہے۔ آپ اپنی طرف سے اُسے مار چکے

تھے آپ آج صبح سے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ لیکن اس شام تک آپ لوگ کے پتا نہیں تھے۔ لیکن اب جبکہ میں نے . . . نہیں میں لوگ کے بارے میں . . .

لوگ : پتا جی ——— ماتا جی کا کیا ہوگا۔ میں . . . . میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ آپ ماتا جی کو بھی ساتھ لے چلیے۔

ماں : نہیں، میں اس گھر سے باہر نہیں جاؤں گی، اور نہ میں لوگ کو جانے دوں گی۔ کچھ تو پرماتما سے ڈریے . . . . ہے ایشور! پہلے تو نے میرا سہاگ چھینا اس کے بعد میں نے اپنا دل اس بچے سے لگایا۔ میں نے دن رات اسے اپنا اپنا کہا، اور آج اسے بھی مجھ سے چھینا جا رہا ہے . . . . . .

لوگ : تو یونہی اتنا گھبرا رہی ہے ماں! میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ اگر میری سگی ماں بھی آجائے تو میں اس کے ساتھ نہ جاؤں۔

شری پت : دیکھیے، آپ گھبرائیے نہیں میں زبردستی لوگ کو آپ کے پاس سے نہیں لے جا رہا۔ میں آپ سے اس کی بھیک مانگتا ہوں۔ جب تک میں نے اُسے دیکھا نہیں تھا، تب تک تو ٹھیک تھا۔ اب جبکہ میں نے اُسے ایک نظر دیکھ لیا ہے تو میں اُسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔

ماں : (روتی ہوئی) نہیں نہیں . . . نہیں نہیں . . . . .

شری پت : اس بات پر ٹھنڈے دل سے غور کیجیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ آپ نے اسے پالا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ اگر آپ اسے نہ پالتیں، تو آج میں اس بچے کا منہ نہ دیکھتا۔ شاید یہ کہیں کسی ٹانگے ٹم ٹم کے نیچے آکر مر جاتا یا کسی یتیم خانے میں چلا جاتا۔ اور زندگی بھر میں اس کا منہ نہ دیکھ سکتا۔ لیکن اب . . . . . اب اصل حالات کو دیکھیے . . . . اور قانون کی نظروں میں بھی لوگ میرا بیٹا ہے!

ماں: میں نے جب اسے لیا تو اسی لیے کہ اس کا دُنیا میں نہ کوئی ماں ہے نہ باپ . . . ماں تو اس کی مر چکی تھی، کاش باپ بھی . . . نہیں میں آپ سے چھپا چاہتی ہوں۔ میں نہیں جانتی میں کیا کہہ رہی ہوں مجھے پتا ہے کہ میں ابھاگی جس چیز کو اپنا کہوں گی وہ پرائی ہو جائے گی۔

شری پت: یہ سمجھ لیجیے کہ آپ ہی اس کی ماں ہیں آپ جب جی چاہے اس سے مل سکتی ہیں، اسے اپنے پاس بُلا سکتی ہیں۔ اور اگر آپ کی طبیعت چاہے تو میں آپ کو اس بچے کی خاطر ہلڈانگ لے جا سکتا ہوں۔

ماں: نہیں۔ میں اس گھر سے باہر قدم نہیں رکھوں گی میرے سواس یہیں ختم ہوں گے میں اِس گھر کو نہیں چھوڑوں گی اور یوگ بھی یہیں رہے گا۔

یوگ: نہیں پتا جی! میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ آپ سے ہو سکتا ہے تو اپنے کاروبار کو سمیٹ کر یہاں لے آئیے۔ میں کہیں نہیں جا سکتا۔ میری پڑھائی میں ہرج ہوتا ہے۔

ماں: نہیں۔ آپ کو کسی نے بہکایا ہے۔ ورنہ آپ اتنے پتھر دل نہ ہوتے۔ آپ ہی کا بیٹا، آپ سے منّت کر رہا ہے۔ وہ بیٹا جسے آپ نے کھو کر پا لیا ہے جسے آپ آٹھ سال کے بعد ملے ہیں۔ ہائے ایشور۔ اِس سنسار میں دُکھ ہی دُکھ ہے!

شری پت: دیکھیے، آپ بھاؤناؤں سے کام نہ لیجیے۔ ٹھنڈے دل سے غور کیجیے۔ محلّے پنچایت سے صلاح کر لیجیے۔ سب یہی کہیں گے کہ شری پت اس بچّے کا باپ ہے۔ اس لیے وہ اسے لے جائے گا۔ باقی رہا اس آٹھ سال کا خرچ وغیرہ۔ سو آپ جتنا چاہیں، مجھ سے لے سکتی ہیں۔ یہ کچھ روپیا میں ابھی آپ کی بھینٹ کرتا ہوں۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ آپ کی نِشچھل سیوا ہے۔

ماں: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں نے ان روپوں کی خاطر اس بچّے کو پالا؟ کیا میرا

یہ خیال تھا کہ یوگ کا باپ آئے گا اور مجھے روپے دے کر اسے لے جائے گا۔ آپ ماں کی محبت کا مول دے رہے ہیں؟ آپ مجھے اتنا نیچ سمجھتے ہیں...

یوگ: پتا جی! آپ ماں کو رلا رہے ہیں۔ اگر آج.....

شری پت: نہیں میں ممتا کا مول تول نہیں کر رہا ہوں۔ میں صرف یہ پیسے اس لیے دے رہا ہوں کہ شاید پیسوں سے یوگ کی کمی پوری ہو جائے۔ جیسے پیسے والی بیوہ اپنے رنڈاپے کے دن تھوڑی آسانی سے کاٹ لیتی ہے....

ماں: نہیں، میں پیسے والی عورت ہوتی تو ایک دن بھی رنڈاپا نہ کاٹ سکتی (بلند آواز میں) آپ ہٹا لیجیے میرے سامنے سے پیسے ——— ہٹا لیجیے ——— اٹھا لیجیے ———!

(پیسوں کے ساتھ تپائی پر سے دوسری چیزیں بھی گر جاتی ہیں)

شری پت: ان باتوں سے میں اپنے بیٹے کو نہیں چھوڑ سکتا۔

یوگ: (روتے ہوئے) میں ماں کے پاس رہوں گا۔

ماں: لے جائیے ان پیسوں کو جس نے آپ کو بہکایا ہے۔ اس کی بھینٹ کر دیجیے شاید اُسے پیسوں کی ضرورت ہو۔ مجھے نہیں۔ میں یہ ہانی نہیں جھیل سکتی۔ جائیے یہاں سے چلے جائیے۔ اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لے جائیے۔ اگر میری چیز ہوتی تو میرے پاس رہتی۔

شری پت: لیکن سینے تو.....

ماں: نہیں، میں آپ کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں، چلے جائیے۔ اور اپنے بیٹے کو بھی لے جائیے۔ میں اس کی ماں نہیں۔ میں اس کی ماں بننے سے انکار کرتی ہوں، میں نے دس سال کا رنڈاپا کاٹا ہے تو اسے بھی سہہ جاؤں گی۔ اگر میں اتنے کڑے دل کی عورت نہ ہوتی تو میں اس طرح بڈھوا

نہ ہوتی ـــــــ

یوگ : ماں ـــــــ !

ماں : چلے جائیے یہاں سے، لے جائیے اپنے بیٹے کو اور ان کاغذ کے پرزوں کو...... خبردار جو اس دہلیز پر شری پت اور اس کے بیٹے نے قدم رکھا تو...... میں ابھی پولیس کو بلواتی ہوں ـــــ ہاں نہیں جانتی تھی انسان اتنا کمینہ ہو سکتا ہے کہ وہ ان چیزوں کا سودا کرے...... جاؤ...... چلے جاؤ۔

شری پت : چلو بیٹا۔

یوگ : میں نہیں جاؤں گا ـــــــ نہیں جاؤں گا !

شری پت : نہیں، ہم چلیں گے...... (یوگ کی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے) لیکن مجھے بہت افسوس ہے کہ...... اچھا۔

ماں : ایک دم سیڑھیوں سے اتر جائیے۔

(کچھ دیر کے لیے شری پت ٹھٹک جاتا ہے ـــــ پھر یوگ کو ـــــــ اس کے احتجاج کے باوجود دروازے کی طرف لے جاتا ہے)

یوگ : میں نہیں جاؤں گا ـــــــ میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔

(انتہائی غیظ یوگ کی ماں پر غلبہ پا لیتا ہے)

ماں : ...... شاید ...... شاید اس کمینے آدمی کے دل میں کبھی یہ خیال آئے کہ اس نے غلطی کی۔ شاید وہ پچھتائے اپنے کیے پر۔ پھر ان سیڑھیوں پر قدم رکھیے۔ (دانت پیس کر) ...... ذرا بات سنتے جائیے گا۔

(شری پت واپس آتا ہے اور یوگ کا راستہ روکنے کی غرض سے دروازے میں کھڑا رہتا ہے)

یوگ : مجھے اس طرح نہ بتاؤ ماں ـــ میں مر جاؤں گا، ماں !!

ماں :۔ ٹھہرو...... تم نے استری کی بھاؤ ناؤں کا مول ڈالا ہے نا۔ ممتا کی
قیمت لگائی ہے —— تو میں تمہارا مول نہیں لگا سکتی؟ لاؤ روپے
ادھر پھینکو تاکہ میں تم ایسے کمینے رذیل انسان کو کبھی بھولے سے نہ دیکھ
پاؤں —— شاید کہیں پہنچا تا پ پھر تمہارے نیچ قدم میرے
دروازے پر ڈال دے۔

شری پت : (روپے دیتے ہوئے) لیجیے —— لیکن میری بات تو سنیے۔

ماں : یہاں رکھ دیجیے پیسے —— اور اب جائیے (بلند آواز میں) دیکھ
کیا رہے ہیں —— چلے جائیے، اس سمے......

(شری پت گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ لڑکی کی ماں غش
کھا کر پلنگ پر گر جاتی ہے —— پردہ گر جاتا ہے)

Uzma Masood

نقلِ مکانی

نفیس: ایک معمولی آدمی جو محکمۂ شہر میں ملازم ہے

عذرا: نفیس کی قبول صورت بیوی ۔ گانے کا شوق رکھتی ہے

مراتب: کاٹھ بازار کا پنواڑی

سیّاں: ایک آوارہ اور ذہین طالب علم جس کا اصل نام امجد حسین ہے

بنواری لعل } محلّہ دار
مرزا شوکت

سب انسپکٹر مائیکل

دو سپاہی

شیو برت: ایک عیّاش رئیس

پہلا منظر

محلّہ کاٹھ بازار کا ایک مکان نفیس اور اُس کی بیوی عذرا اس مکان
میں نئے آئے ہیں۔ ابھی ان کا سامان اِدھر اُدھر بکھرا پڑا ہے جسے دونوں
میاں بیوی قرینے سے دھرنے میں مصروف ہیں۔

عذرا : (آرام کے پیپے رکھتے ہوئے) توبہ! کتنی خاک چھانی۔ ۔ ۔ اور جو ملنے کو آیا مکان
تو کیسے جھٹ سے مل گیا۔

نفیس : (چارپائی پر بیٹھ کر اپنا نیا جوتا اُتار دیتا ہے اور اپنے پاؤں سہلاتا ہے) ہاں،
اسی بات پہ تو میں حیران ہو رہا ہوں۔ دراصل مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا
کہ میں کسی اور مکان میں بیٹھا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پاؤں ابھی تک دکھ رہے ہیں ایک
سارے دن کی دوڑ دھوپ، دوسرے نیا جوتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (پلٹ کر) عذرا تھوڑا
پانی تو گرم کر دو بھئی۔

عذرا : معلوم ہوتا ہے حمام کا پیندا ادلا بدلی میں ٹوٹ گیا ہے۔ لیکن پانی گرم ہو جائے گا

نفیس : جب بوجھے کو سر پر سے پھینک دیا جاتا ہے تو کتنی دیر یوں معلوم ہوتا ہے
جانے کوئی اوپر کی طرف اٹھا رہا ہے۔ اتنی تھکن اور تکلیف کے ہوتے ہوئے
بھی ایک طرح کا سبک پن۔ ۔ ۔ ۔

عذرا : چشم بد دور! بس انھی دو کمروں کی ضرورت تھی اور اتنا ہی کرایہ دینے کی
توفیق۔ مہنگائی کے اِن دنوں میں سولہ روپے بھی بھلا کوئی کرایہ ہے؟
(پھر کام میں مشغول ہو جاتے ہیں)

نفیس : اندازہ کرو۔ وہ حویلی بکائن والے اُن کمروں کے پچاس روپے بتاتے تھے شاید

انھیں سمجھنے والا انہیں کوئی میں نے تو کہہ دیا تھا کہ تنخواہ فرق کر لیا کرو صاحب
سوچو، اتنے کمروں کی انہیں ضرورت بھی کیا تھی؟

عذرا: اور جو نئی آبادی میں گھر دیکھے تھے، یاد ہیں؟ سیل کتنی دور چھت کی طرف
لپکا ہوا تھی اور پڑوس کی گوجرانی بضد کہ ہم اوپلے دیوار پہ ہی تھاپیں گے
لے کبھی تو اب تھاپ لے اپلے چھت پر کے درک کر، لیکن میں اگر
وہاں رہ جاتی تو اسے بتا دیتی ایک بار۔

نفیس: ہاں، وہ تو تمہاری بات ہی ہے۔

عذرا: اور وہاں کھڑا کرکٹ جلانے والی بھٹی بھول گئے ... اُف ... اُف ...
کتنی بو آتی تھی! ... (ناک پر دوپٹہ رکھ لیتی ہے)

نفیس: اس بوڑھی نے کس آرام سے چابیاں تھما دیں میرے ہاتھ میں (ایک دم رک کر)
مجھے تو یہ دال ہی کالا نظر آتا ہے۔

عذرا: اور کہہ رہا تھا کہ چھ مہینے سے خالی پڑا ہے مکان۔ کوئی گاہک نہیں لگا ہوگا
[illegible]

نفیس: [illegible] ـــــ دیواریں کچھ خراب ہیں، لیکن ...
(دیوار کو چھوتا ہے)

[illegible]

عذرا : (ہنس کر) شاید اندھیرا پسند کرتے ہوں۔

نفیس : تمھیں اندھیرے کے معجزوں کا کیا پتا۔ جب اندھیرا ہوتا ہے تو بہت سی خدائی کا ایک طرح سے دن شروع ہوتا ہے (میز کو کونے کی طرف سرکاتے ہوئے) . . . . اس میز کو ہاتھ دیجیو ذرا . . . . .

(کونے میں پڑے ہوئے گھنگرو نفیس کے پاؤں کے ساتھ ٹکراتے ہیں)

ارے ! ـــــ یہ کہاں سے آئے ؟

عذرا : (میز رکھ کر) دکھاؤ۔

نفیس : ہم سے پہلے یہاں رہنے والے اسے یہیں بھول گئے۔

عذرا : ان میں سے کوئی ناچتا ہوگا۔

نفیس : تمھارے لیے چھوٹ گئے معلوم ہوتے ہیں، لیکن انھیں کیا معلوم کہ نئے آنے والوں میں بھی کوئی گانے کا شوق رکھتی ہے اور گاہے ماہے ـــــ

عذرا : گاہے ماہے کیا ؟

نفیس : ـــــ تھرک بھی جاتی ہے۔

عذرا : اوہو، جانتے ہی نہ ہوں بھلا۔

نفیس : ذرا پاؤں میں باندھو اور . . . . . .

عذرا : ہونہہ ! اسباب جوں کا توں بکھرا ہوا ہے اور آپ کو اپنی پڑی ہے . . . میں سوچتی ہوں اس شمعدان میں سرسوں کا تیل جلانے والے اتنے باذوق تھے ؟

نفیس : تو کیا خوش مذاقی کا امیر لوگوں نے اجارہ لے رکھا ہے (عذرا کے سامنے میز پر بیٹھ جاتا ہے) اپنی طرف دیکھو تم . . . . .

عذرا : (شرما کر) چلو ہٹو۔

نفیس : بات یہ ہے تم بھی عام آدمیوں کی طرح باہر کی ٹیپ ٹاپ دیکھتی ہو، میں

اگر اچھی شکل والا ہوتا اور اچھے کپڑے پہنے ہوئے ہوتا تو شاید مکان کے لیے مجھے اتنا پریشان نہ ہونا پڑتا جس کے سامنے جا کر مکان کے لیے سوالی ہوا اُس نے پہلے مجھے سر سے پاؤں تک ناپا اور پھر جھٹ سے کہہ دیا ـــــ کون زمانے کی بات کرتے ہو میاں، راستہ پکڑو . . . . گویا میں اٹھائی گیرا ہی تو ہوتا ہوں۔ (غصے کے ساتھ میز پر سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے) بعض دفعہ جی چاہتا ہے اٹھائی گیرا ہی تو ہو جائے آدمی . . . . .

(عذرا کی طرف دیکھتا ہے تو غصہ اتر جاتا ہے)

دُور کیوں جاؤں، میں اپنی عذرا کے لیے وامق نہ ہوا . . . . .

عذرا : یہ وامق کون احمق تھا ؟ . . . . . اور پھر اس بات کا تقاضا کرنا بھی تو سنک ہے کہ کوئی آدمی کو اندر سے دیکھے اور باہر سے نہ دیکھے۔ تمھارا کیا خیال ہے رُوح جسم کو خوبصورت یا بدصورت نہیں بناتی ؟

نفیس : یہ الگ بحث ہے عذرا . . . . . لاؤ ذرا ہتھوڑی پکڑانا، کھڑکی پہ کیل گاڑ دوں (کھڑکی کی طرف بڑھتے ہوئے) میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر تم کسی کی شکل دیکھ کر اس کی طینت کے متعلق شک کرو تو اُس شخص کی بدطینتی پہ افسوس نہیں کر سکتیں . . . . . .

عذرا : دیکھو، دیکھو، دیکھو . . . . . یہ باہر جو کھڑکی کھلتی ہے، پان کی پیک سے بھری ہوئی ہے۔ اِدھر ہاتھ مت بڑھانا میں کہتی ہوں . . . . . یہ پان کی پیک، یہ شمعدان . . . . میرا ماتھا ٹھنکتا ہے، ذرا بلاتا تو بنواڑی کو۔

نفیس : ہرا تنبہ کو ؟ ـــــ میں بلاتا ہوں۔ تو ابھی دیا جلا دے شام ہو رہی ہے

عذرا : دیا تو ٹوٹا ہوا ہے لیکن اس کٹوری سے دیے کا کام چل جائے گا۔

نفیس : ہاں، ہاں اسی کٹوری کو شمعدان پر رکھ دو۔

عذرا : میں تو نہ رکھوں شمعدان پر کٹوری کو .... تم مراتب کو بلاؤ۔ یا تو اس جگہ چھوت کی بیماری کا کوئی مریض رہا ہے اور یا ... یا ....

نفیس : ورنہ آج کل جنگ کے دنوں میں اتنی دیر مکان خالی رہنے کے کیا معنی ؟

(دروازے سے باہر جھانک کر)

مراتب .... میاں مراتب، ذرا اِدھر آنا بھا ـــــ ئی !

(دُور سے آواز آتی ہے)

پنواڑی : آیا صاحب !

نفیس : (عذرا سے) جانے کیا ماجرا ہے ... چھوت کی بیماری کے علاوہ کیا اندازہ لگانے لگی تھیں تم ؟

عذرا : اِس مکان میں کوئی پیر رہتا ہوگا، اور یہاں رہنے والے اس کا دیا جلاتے ہوں گے، اور جہاں تک میرا خیال ہے ہفتہ بھر میں ایک دو دن ضرور بہر کار دیا جلانا پڑتا ہوگا، نہیں تو بجلی والے اس مکان میں سرسوں کا تیل جلانا کیا مطلب رکھتا ہے ؟

نفیس : اب تمھیں بھی اس مکان میں نقص نظر آنے لگے ـــــ ایک برس ہوا ہمیں مکان تلاش کرتے ہوئے تب کہیں جا کے یہ دو اچھے کمرے ملے ہیں۔

عذرا : میں خود اسے پسند کرتی ہوں لیکن .....

نفیس : میں لیکن ویکن کچھ نہیں جانتا۔ مجھ سے اب مکان تبدیل نہ ہوگا۔ یہ سمجھ رکھیو.. چھوت کا مریض رہا ہوگا تو فرش فنائل سے دھو لیں گے۔ سفیدی کروا لیں گے، دیواریں کھدوا کر نیا پلستر کروا لیں گے ـــــ پیر ہوا تو روز سرسوں کا دیا جلا لیں گے۔

(دروازے میں مراتب نظر آتا ہے)

مراتب : ۔ حکم سرکار ۔
نفیس : بڑے میاں ہمیں ایک بات پوچھنا ہے ۔
عذرا : (ڈرتے ہوئے) ہاں بڑے میاں ۔ ٹھیک ٹھیک بتا دو ۔ تم نہیں بتاؤ گے تو ایک دن ہمیں اپنے آپ پتا چل جائے گا ۔ کیا یہاں کوئی بیمار رہا ہے یا کوئی پیر ہے جس کا دیا جلانا پڑتا ہے یا کوئی اور بات ہے ؟ دیکھو جھوٹ مت بولنا ، آخر تم بھی بال بچے دار ہو !
پنواڑی : دیکھیے ، سرکار ۔ جھوٹ بولنا اپنا اصول نہیں ہے اور پھر یہ مکان کون میرا اپنا ہے جس کی خاطر اپنا ایمان گروی رکھوں ...... آپ سے پہلے یہاں شادو رہتی تھی ۔
نفیس : شادو رہتی تھی ، کون شادو ؟ ______ ؟
پنواڑی : شادو ______ شمشاد بائی ! (عجیب سی ہنسی ہنستا ہے) آپ اسے نہیں جانتے ! واہ ۔ اس شہر میں کون بابو لوگ ہے جو شادو کو نہیں جانتا !
نفیس : (کچھ برہم ہو کر اپنے ہات کوٹ کی جیبوں میں ٹھونس لیتا ہے) میں جھوٹ تھوڑے ہی کہہ رہا ہوں ، بڑے میاں ! ہمیں تمھاری شادو سے کبھی واسطہ نہیں پڑا ۔
پنواڑی : اجی بابو صاحب ! شادو کے قصے اخباروں میں چھپ گئے ۔ اس کے نام کے اشتہار بازاروں میں لگ گئے اور آپ کہتے ہیں پتا ہی نہیں ......
نہیں نہیں ، دراصل آپ مجھے بنا رہے ہیں ______ ہیرا تا ؟ شادو یہاں " جس طرح مجھ کو لگی ہے میرے بلند کسو کی " گایا کرتی تھی اور بڑے بڑے لوگ اس کا مجرا کرواتے تھے وہ بڑی امیر تھی لیکن تھی بڑی کنجوس ______ آخر اسے سمجھ آ گئی کہ پنا جوک میں چاہئے دھندا نہیں ہوگا ۔
عذرا : تو شمشاد بائی کوئی طوائف ....

پنواڑی: ۔ جی ہاں، طوائف ہی تو تھی۔ ۔ ۔ ۔ اُس کے مقدمے کی بابت بھی آپ نے کچھ
نہیں پڑھا، وہ دراصل بہت بڑی رنڈی تھی جو میرے پلیڈر کسوکی، گایا کرتی تھی
ـــــ شادو! اسکاٹھ بازار کے بیچ میں سرکار نے بھی پسند نہ کیا۔ اور ایسے نوٹس
دیا، پولیس بھی آئی لیکن شادو کو کوئی نہ ہلا سکا۔ پھر وہ اپنی مرضی سے چلی گئی۔۔۔

نفیس: تم نے پہلے اس بات کا ذکر نہیں کیا۔

پنواڑی: مجھے اس بات کا خیال ہی نہیں آیا۔ اور میرا خیال تھا آپ جانتے ہی ہوں گے۔
دراصل آپ نے اتنی جلدی کی ـــ چار بجے شام آپ نے چابیاں لیں اور چھ
بجے یہاں آدھمکے۔ اب کیا بگڑ گیا ہے، مکان پر آپ کی مُہر تو لگ ہی نہیں گئی۔

عذرا: لیکن اب ہم جائیں کہاں۔ جو مکان ہم نے خالی کیا۔ اس کے بیسیوں گاہک تھے
اِدھر ہم نے سامان نکالا اُدھر انھوں نے رکھ لیا۔

نفیس: یہ بات تو چابیاں دیتے ہی بتا دینی چاہیے تھی۔ مرزا صاحب!

پنواڑی: میں نے تو سمجھا تھا آپ اس قصّے کو جانتے ہی ہوں گے۔

نفیس: (چمک کر) پھر وہی بات۔ کیا ہمیں بھی تم ایسے غیرے سمجھتے ہو جو یہ جانتے
ہوئے بھی چلے آئیں ـــــ جاؤ، کتھا اور چونا لگاؤ اور شادو کے گیت
گاؤ۔۔ معلوم ہوتا ہے تمھیں بھی شریف اور بد معاش میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

پنواڑی: دیکھیے ذرا سنبھل کر بات کیجیے۔ کسی کے ماتھے پہ شریف تھوڑا ہی لکھا ہوتا ہے
میں نے جانا جیسے دوسری دنیا ہے ویسے ہی آپ ہوں گے۔

عذرا: اب زیادہ باتیں بنانے کی ضرورت نہیں ہے بڑے میاں!

پنواڑی: میں نے کوئی بری بات نہیں کہی [illegible]
[illegible]
[illegible]

وقت ہوتا ہے تھوڑے پیسے کمانے کا ——— (جاتا ہے)

عذرا : (مایوسی سے) اب کیا کریں؟

نفیس : (سرد آہ بھر کر) چلو، یہ طلسم بھی ٹوٹ گیا، مجھے یقین ہو چلا تھا کہ تمام دنیا ایک سی نہیں ہے۔ کم سے کم ایک آدمی ایسا ہے جس نے ہماری شرافت کی قدر کی ہے .... (کھڑکی کی طرف جاتا ہے) پان کی پیک سے بھری ہوئی یہ کھڑکی بتا رہی ہے کہ شاد و اس پنواڑی کی آمدنی کا ذریعہ تھی اور اس کے چلے جانے کا مرانب کو افسوس ہے .... (سوچتا ہے) .... عذرا ان گھنگروؤں کو وہاں رکھ دو اور آ کر بیٹھ جاؤ۔

عذرا : (ادھر اُدھر دیکھ کر) خدا جانے یہاں کیا کچھ ہوتا رہا ہے! (سہم کر نفیس کی بغل میں بیٹھ جاتی ہے)

نفیس : جانے کون جاگیریں اجڑتی رہی ہوں گی اور کن کن کے سہاگ کا مذاق اڑایا گیا ہوگا۔

عذرا : بھانت بھانت کے آدمی آتے ہوں گے یہاں .....

نفیس : یونہی تھوڑے سے ہمارا سنگ اسود کالا اور کثیف ہوتا جا رہا ہے .... لیکن دیکھو عذرا، اب جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ طوائفوں کی بستی جب شہر کے بڑھنے سے باہر چلی جاتی ہے تو ان کی جگہ تمہارے ایسی گرہستنیں ہی تو رہتی ہیں ———

عذرا : (سمٹ کر) یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن مجھے ڈر سا لگتا ہے، جیسے میرا دل کسی بات کو مان نہیں رہا۔

نفیس : مجھے تو اس بڈھے کی بیوقوفی پہ ہنسی آتی ہے (ہنس کر) "تم شاد و کو نہیں جانتے ہو؟" لیکن عذرا جب تک اپنا دل صاف ہے ہمیں کسی بات سے نہیں ڈرنا

چاہیے۔ دوسرے کے گناہوں کا حساب ہمیں تھوڑے ہی دینا ہے ـــــ میں بستر کھولتا ہوں، تم دیا سلائی سے ذرا بتی اونچی کر دو۔

عذرا: یاد آیا۔ تم نے گرم پانی کے لیے کہا تھا۔ شاید ٹوکری میں کوئلے ہوں.... مجھے یہ سارا گھر جانے بیماری کے کیڑوں سے پٹا ہوا معلوم ہوتا ہے ـــــ میں کیا کروں، میرا دل یونہی کانپ رہا ہے۔

نفیس: عذرا ـــــ میری جان! اب ایک نیا مکان تلاش کرنا خالہ جی کا باڑا تو ہے نہیں۔ یہاں سب طرح سے صفائی ہو جائے گی۔ فنائل، سفیدی سب ٹھیک ہو جائے گا اور پھر جس جگہ پر بیٹھ کر اللہ کا نام لیں گے وہ جگہ پاک اور صاف ہو جائے گی، میرا مطلب ہے......

(دروازے پر دستک سنائی دیتی ہے)

عذرا: یہ کون ہوا بھلا؟

نفیس: خدا جانے کون ہے ـــــ اور اسے ہمارے یہاں ہونے کا کیسے پتا چل گیا؟

عذرا: دیکھو تو ـــــ کہیں تمھارا بھانجا ہی نہ ہو۔ میں نے کہا تھا ادھر ہم نئے ہیں۔ ذرا خبر لیتے رہنا۔ اور ہاں تمھاری بھانجی کی شادی طے ہو گئی ہو گی ـــــ نصیرہ کی۔ دیکھو تو۔

(نفیس جاتا ہے اور دروازہ کھولتا ہے)

نفیس: آئیے صاحب!

سیّاں: السلام علیکم۔

نفیس: وعلیکم السلام: کہیے کیسے تشریف لائے، آپ کا نام.....؟

(عذرا اُٹھ کر اندر چلی جاتی ہے)

سیّاں: میرا نام؟ ... میرا اصلی نام امجد حسین ہے۔ میں یہاں طالب علم ہوں۔

.... یہاں کا مطلب یہ مکان نہیں ۔ میری مراد اس شہر سے ہے ....
لیکن مجھے سب ستیّاں کے نام سے پکارتے ہیں ۔

نفیس : کہیں آپ اِس مکان کے مالک تو نہیں ؟

ستیّاں : نعوذ باللہ —— نہیں ! .... لیکن ایک طرح سے مالک ہی سمجھیے ....

نفیس : معاف کیجیے ، میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکا .... اور نہ آپ کا اس وقت تشریف لانے کا مدّعا جان سکا ہوں ۔

ستیّاں : دیکھیے ، ایک وقت میں ایک سوال کیجیے تاکہ آپ کو سوال کرتے ہوئے الجھن ہو اور نہ مجھے جواب دیتے ہوئے کوفت محسوس ہو ۔ یہی تو ظلم ہوتا ہے میرے ساتھ کہ ایک سانس میں لوگ مجھ سے بیسیوں سوال کر جاتے ہیں ، .... کالج میں ، گھر میں ، بازار میں ہر جگہ یہی ظلم ہوتا ہے .... تو پہلے آپ میرا نام پوچھ رہے تھے ۔

(آگے جانے کی کوشش کرتا ہے لیکن نفیس اسے اشارے سے وہیں چارپائی پر بٹھا دیتا ہے)

نفیس : جی ہاں ، نام پوچھ رہا تھا —— اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو ......

ستیّاں : میں نے عرض کیا نا ، میرا اصل نام امجد حسین ہے ۔

نفیس : نہیں صاحب ! اس سے پہلے نام کے بارے میں قطعاً کوئی بات نہیں ہوئی ۔

ستیّاں : (پُر شکوک انداز میں) کوئی بات نہیں ہوئی ؟ .... مگر اس کا کیا مطلب ہے ، آج یہاں نام کیوں پوچھا جا رہا ہے ؟ .... خیر میرا نام امجد حسین ہے لیکن مجھے سب ستیّاں کے نام سے پکارتے ہیں ۔

نفیس : آپ [illegible] آپ کو ستیّاں کے نام سے [illegible] ہوگی ؟

ستیّاں : [illegible] لیکن .... لیکن .... سو آپ نے درویش صورت [illegible]

انسان بھی یہاں ..... سچ ہے بابا سب سچ ہے .....

(اٹھ کر اندر جانے کی کوشش کرتا ہے)

نفیس: آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے .... دیکھیے آپ زبردستی اندر جا رہے ہیں، اور آپ پیے ہوئے ہیں۔

سیّاں: شش شش۔ خاموش۔ میں سیّاں ہی تو ہوں، جاؤ اندر جا کر شادو کو اطلاع کر دو۔

نفیس: دیکھیے سیّاں صاحب۔ اب آپ کی شادو یہاں نہیں رہی۔ یہ شریف آدمیوں کے رہنے کی جگہ ہے۔

سیّاں: شکل سے تو آپ شریف ہی نظر آتے ہیں واللہ۔ اجی میں ہر روز تھوڑے ہی ادھر آتا ہوں۔ جب ڈپٹی صاحب منی آرڈر بھیجتے ہیں اور امتحان کے دن نزدیک آتے ہیں .... اوہ ڈپٹی صاحب کے نام سے ڈر گئے؟ ارے سیّاں بھئے کوتوال اب ڈر کا ہے کا۔ تم یہ بازو راستے سے ہٹا لو ....

نفیس: دیکھو، دیکھو میاں صاحبزادے تم کیا کر رہے ہو؟

(پکڑ کر چارپائی پر بٹھا دیتا ہے)

سیّاں: سو تم وہ بیرکا کے رئیس ہو۔ تمھی نے شادو کو گھر ڈالنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے تم نے اسی گھر کو اپنا گھر بنانا اچھا سمجھا۔ میں سمجھ گیا سب کچھ سمجھ گیا۔

نفیس: دیکھو، زیادہ باتیں مت بناؤ، کہے دیتا ہوں۔ یہاں سے فوراً نکل جاؤ ورنہ میں شور مچاؤں گا۔

سیّاں: شور مچاؤ گے اور لوگوں کو اکٹھا کرو گے؟ ہیں! ارے یار اپنے تمہارے ہاتھ انشا اللہ نہیں کیا پتا چلتا ہے۔ کیا تم خود بدنام نہ ہوگے؟ لوگ ہاتھ نہیں نہیں کہیں گے اور دشمن بنی باتیں بنائیں گے۔ لوگوں کو بیچ اور حویلی کی طرف بیٹھا دیا یہ کیا الٹا ہے؟ کبھی شریف لوگ بھی شور مچاتے

ہیں؟ وہ ہر قسم کی ذلت چپکے سے برداشت کر لیتے ہیں، کیونکہ وہ شریف ہیں۔
(ایک ہچکی آتی ہے۔ نفیس کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ستیاں
اسے روک دیتا ہے)

میرے باپ کی کچہری میں روز عزت کے لیے مقدمے لڑے جاتے ہیں اور عزت
چاہنے والوں کی خوب بے عزتی ہوتی ہے۔ ان کی ماں اور بہن کے متعلق وہ کچھ
کہا جاتا ہے کہ سُن کر کانوں کے پردے پھٹ جاتے ہیں۔ اسی لیے شریف آدمی
اپنی بیٹی تک کی بے حرمتی دیکھ کر عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹاتے ——

نفیس: میاں صاحبزادے، یہ سب درست ہے، اسی لیے میں تمہیں منت سے ٹل جانے
کے لیے کہتا ہوں، ورنہ شاید مجھے شور مچانے کی بھی ضرورت نہ پڑے۔

(ستیاں کو ڈھکیلتا ہے)

ستیاں: دیکھو —— مجھے ڈھکیلو مت۔ باتیں کرنے سے تمہیں کوئی نقصان نہیں
پہنچ سکتا (قدرے بلند آواز میں) شادو، مجھ سے یہ بدسلوکی دیکھ کر تم چپ
بیٹھی ہو؟ (اندر دیکھتے ہوئے) تم اتنی دُبلی کیوں ہو گئی ہو! یا شاید یہ میری
آنکھوں کا قصور ہے۔ (لرزتی ہوئی آواز میں) مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا
.... کتابیں لکھنے والوں نے ایک ہی چیز کے متعلق متضاد باتیں کہہ کر میرے
دماغ کو الجھاؤ میں ڈال دیا ہے .... میری آنکھوں میں نقص ہے۔
(ڈر جاتا ہے) وہی چیز جسے میں دیکھنا چاہتا ہوں نظر نہیں آتی —— اِرد گِرد
کی سب چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن وہ چیز جس پر میں نگاہ ڈالتا ہوں،
درمیان سے غائب ہو جاتی ہے ....

کیا اس سے بڑی بیماری بھی ہے کہ تم جو چاہو تمہیں دکھائی نہ دے
اور جو نہ چاہو نظر آتا رہے۔ دیکھو، تم پھر ڈھکیلنے لگے۔ باتیں سننے میں کیا ہرج

ہے بھائی؟ ... شادو! تمھیں ویرکا کے اس رئیس نے گھر ڈال لیا ہے (اندر دیکھتے ہوئے) کیا یہ سچ ہے کہ یہ خبیث تمھیں باہر کی روشنی نہیں دکھاتا اور اسی لیے تم اتنی مریل ہو گئی ہو ــــــ لیکن تمھارا رنگ اور بھی کھل گیا ہے ... نہیں، مجھے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا ـــ تمھیں ویرکا کے رئیس نے نہیں، تمھیں اس بڑے ویرکا کے رئیس نے مجھ سے چھین لیا ہے ــــــ خدا نے بے رحم خدا نے ....

(رونے لگتا ہے)

نفیس: خدا جانے میں تمھاری باتیں کیوں سنتا جا رہا ہوں؟ تم شکل سے شریف خاندان کے لڑکے نظر آتے ہو، شاید اس لیے۔ لیکن تم ہو کہ برابر شور مچائے جا رہے ہو۔ لوگ سُن کر کیا کہیں گے؟

سیّاں: لوگ؟ لوگ کیا کہیں گے؟ ... دیکھو مجھے گھورو مت۔ ہر جگہ مجھے یہی "لوگ" گھورتے نظر آتے ہیں۔ ان "لوگوں" نے ہمیں کہیں کا نہیں رکھا۔ انھوں نے میرے ایک دوست کو پاگل کر دیا۔ وہ ذہین تھا، بلا کا ذہین تھا ـــ اسے "لوگوں" نے بتایا کہ عورت کا ننگا جسم ایک ناپاک شے ہوتی ہے اسے مت دیکھو، اپنی آنکھیں بند کر لو۔ خوبصورت چیز کو دیکھنے کی خواہش کو دبا دو، کچل دو ــــــ انھوں نے کہا، پھول کو کپڑے پہنا دو، یہ آرٹ ہے ..... میرے دوست نے پانی میں چند کلیوں کو نہاتے دیکھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، ایک درخت کی آڑ میں کھڑے ہو کر اس نے پھر ان کلیوں کو سیل شبنم میں نہاتے دیکھا، پھر آنکھیں بند کر لیں، دیکھا، آنکھیں بند کر لیں ـــــ خواہش نے آنکھیں کھولیں "لوگوں" نے بند کیں ـــــ کھولیں، بند کیں، کھولیں، بند کیں ـــــ اور آج اس کی آنکھیں پل میں سو بار کھلتی اور بند ہوتی ہیں ـــ وہ ان کا کوئی بھی علاج نہ کر سکا .....

(آنا فانا) شادو! مجھے اس شہد سے بچاؤ —— مجھے یہ تمہارے پاس نہیں
آنے دے رہا، پھر تم نہیں گاؤ گی؟ ——

سیّاں تیری گودی میں گیندا بن جاؤں گی

(نفیس سیّاں کو اٹھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن سیّاں برابر اپنی
بات کہے جا رہا ہے)

سیّاں : امتحان سے ڈر کر آج میں نے بے اندازہ پی (زبان لبوں پر پھیرتے ہوئے)
شراب میرا کلیجہ چٹ کر رہی ہے میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں مجھے بھوک لگی
ہے ..... تم بھول گئیں ——

جو تورے سیّاں کو بھوک لگے گی
لڈو پیڑا جلیبی بن جاؤں گی —— سیّاں توری گودی میں ——

(نفیس سیّاں کو دروازے تک دھکیلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن
سیّاں مضبوطی سے دروازہ پکڑ لیتا ہے)

سیّاں : میں کمرے اور پلنگ کے درمیان دیکھ رہا ہوں —— اور تمہاری پرچھائیاں
نظر آتی ہیں۔ مجھ سے اندھا اچھا ہے شادو۔ ہائے، یہ سب کچھ نظر بھی آ رہا
ہے اور نہیں بھی آ رہا ... میرے اللہ ....

نفیس : (دروازے کی ایک طرف شور نکالتے ہوئے) مراتب —— مراتب میاں!

(دروازے پر تھوڑا سا شور ہوتا ہے۔ وہ کچھ دیر کے لیے رک
جاتی ہے لیکن پھر ایک شور کے ساتھ آگے بڑھتی ہے)

مراتب : صاحب، آپ یہاں کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟ آپ باہر کیوں نہیں چلے جاتے یہ شریف ——
آدمیوں کا محلہ ہے۔ شادو نے یہاں سے مکان تبدیل کر لیا ہے آپ
اب یہاں تو آیا نہ کریں ...

سیتیاں: (پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) یہ آواز بھی گھر اور بازار کی آوازوں میں کھو کر رہ گئی۔ یہ شادو کی آواز نہیں اس سے اچھی آواز ہو گی لیکن یہ شادو کی آواز نہیں ـــــ شادو کی آواز ـــــ

(مراتب آتا ہے)

مراتب: ابے کون ہے تو؟ ـــــ نکل باہر شہدے، کمینے .....

نفیس: مراتب! گالی مت دو اسے ـــــ فقط باہر نکال دو ـــــ

عذرا: دیکھو، مارو نہیں، گمراہ طالب علم ہے بیچارہ ـــــ

مراتب: کئی بے چارے گمراہ طالب علم آتے تھے اس کے یہاں ـــــ نکل باہر چھوکرے ....

(کشمکش۔ مراتب اُسے دھکا دے کر باہر گرا دیتا ہے
لڑکے کے گرنے کی آواز کے ساتھ ہی دروازہ بند
ہوتا ہے)

دوسرا منظر

اسی مکان کا سونے کا کمرہ۔ رات کا وقت ہے۔ اور
نفیس باہر سے آکر کپڑے بدل رہا ہے۔ عذرا اُس کا
کوٹ اس کے موزے وغیرہ لے کر باری باری مناسب
جگہ رکھ رہی ہے۔

عذرا: بہت تھکے ہوئے نظر آتے ہو، آج کام بہت تھا کیا؟
نفیس: دفتر میں کوئی کام نہیں ہے۔ البتہ دوسری باتیں تھوڑی ہیں پریشانی کے لیے۔
عذرا: دوسری باتیں؟ ——— کوئی اور مکان دیکھا؟
نفیس: مکان کے لیے بہت کوشش کی لیکن کوئی ہو تو بات بنے۔ یہ غریب ہونا بھی ایک لعنت ہے ورنہ ایسے ہی دو کمرے پینتیس روپے میں ملتے تھے۔
عذرا: پینتیس تو ہم کسی صورت میں نہیں دے سکتے ——— کھانا؟
نفیس: تمہارا خیال ہے میں ابھی تک بھوکا ہوں گا۔ دفتر کی ٹک شاپ سے بہتیرا الّم غلّم کھا لیا اور چائے پی ——— اس دفعہ بل بھی بہت بن جائے گا جب کوئی گھبراہٹ ہوتی ہے تو کھانے پر زور دیتا ہوں۔
عذرا: اور تمہیں کھانا پینا ——— کچھ بھول جاتا ہے (کچھ یاد کرتے ہوئے) میں نے تو بیس بار کہا ہے کچھ پراٹھے ساتھ لے جایا کرو۔
نفیس: کون مصیبت کرے (چارپائی پر بیٹھتے ہوئے) اور پھر دفتر میں لیموں نچوڑ رہا ہوں ہے۔

عذرا : لیموں نچوڑ بابو ؟
نفیس : ہاں، اپنا ایک لیموں کسی کی دال میں نچوڑ کر برابر کا حصہ دار بن جاتا ہے ـــــ
(دونوں خفیف سی ہنسی ہنستے ہیں)
عذرا : تو پھر دو باتیں تو نہیں ہو سکتیں کہ بل بھی نہ بنے اور بھوک بھی اُتر جائے
(نفیس اپنا مُنہ دونوں ہاتھوں میں دے لیتا ہے)
کیوں، چُپ چاپ بیٹھ گئے ؟
نفیس : اور تو کیا شور مچاؤں ؟ دیکھو مجھے یوں تنگ نہ کرو عذرا ـــــ مجھے آرام سے سو جانے دو۔
عذرا : آئے ہائے ـــــ راستہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پک جاتی ہیں۔ شادو کے گاہکوں سے ڈرتے ہوئے، سارا دن کواڑ بند کیے اندر پڑی رہتی ہوں اور اب ـــــ۔
نفیس : (چڑ کر) نہ اندر پڑی رہا کرو۔ میں دیکھنے آتا ہوں کیا خوب رنگ رلیاں منایا کرو مجھ سے یہ ناز برداری نہیں ہونے کی۔
عذرا : (دکھی ہو کر) تم بھی یوں کہو گے تو میں زندہ نہ رہوں گی۔
نفیس : اور میں کون زندوں میں سے ہوں۔ مُردوں سے بدتر ہوں۔ محلّہ والے الگ بدنام کرتے ہیں اُن کا تو خیال ہے کہ ایک شادو گئی اور اس کی جگہ دوسری آ گئی۔
عذرا : محلّہ والے جو جی چاہے کہتے پھریں۔ تمہارے سوا میں کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہوں۔ اگر تم بھی ایسی باتیں کرنے لگے تو میرا کون ٹھکانا ہے ؟ . . . . اب جو لوگ آتے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے ؟ میں تھوڑے ہی کسی کو بلانے جاتی ہوں۔
نفیس : یہی تمہاری بھول ہے کہ تم صرف میرے آگے جوابدہ ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے ہم خودکشی میں حق بجانب ہیں ہم اپنے آپ کو نہیں مار سکتے اگرچہ یہ جسم ہمارا اپنا

ہے۔ اس کے لیے ہم حکومت کے سامنے جوابدہ ہیں۔۔۔ اس جسم کے علاوہ ہمارا ایک اخلاقی جسم بھی ہوتا ہے جسے پامال کرنے کے لیے ہم گلی کوچے کے ہر کتنے ملنے بچے بوڑھے کے حضور میں جوابدہ ہیں ۔۔۔

عذرا : لیکن ہم نے کون سی اخلاقی خودکشی کی ہے ؟

نفیس : اوہ تو تم کچھ بھی نہیں جانتیں۔ تم نے سنا ہے خلق کی آواز نقارۂ خدا ہوتی ہے، بس وہ نقارہ بج رہا ہے اگر تمہارے کانوں میں اس کی آواز نہیں گونجتی تو تم بہری ہو ۔۔۔ اس میں تمہارے کانوں کا قصور ہے۔

عذرا : اس کا یہ مطلب ہوا اگر چار آدمی اُٹھ کر تمہیں بُرا کہنے لگیں تو تم بُرے ہو گئے؟

نفیس : بُرا تو نہیں ہوا لیکن بُرائی سے آلودہ ضرور ہو گیا میرا ایمان ہے کہ دس آدمی مل کر تمہیں کہیں تمہارے چہرے پہ ناک نہیں ہے تو تم ضرور سمجھ لو کہ خدا نے تمہارا چہرہ ناک کے بغیر ہی بنایا تھا اگرچہ آئینہ اس کے خلاف ہی گواہی دے ۔۔۔

عذرا : (زہرخند سے) اچھی بات ہے ۔۔۔ اگر اُن دس آدمیوں نے کسی کو پاگل کر دینے کی سازش کی ہو تو۔۔۔۔۔

نفیس : نہیں نہیں۔ تم اسے مذاق میں ٹالنے کی کوشش نہ کرو جس آدمی کو یہ بات کہنے کے لیے دس آدمی اکٹھے ہوں گے اپنا وقت صرف کر سکیں گے اس آدمی میں ضرور کوئی نہ کوئی نقص ہو گا۔ کم از کم وہ اس قابل ضرور ہو گا کہ اس کا مذاق اُڑایا جائے۔۔۔۔۔ اور جب یہ ہو جائے تو پاگل پنے اور ناک کے نہ ہونے میں صرف عقیدے کا فرق ہوتا ۔۔۔ ؟ دیکھو تم پھر ہنس رہی ہو۔۔۔۔۔

عذرا : ہاں تمہیں میرا ہنسنا ناگوار گزرتا ہے تو میں نہیں ہنستی، لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے ۔۔۔ اور اگر میرا قصور ہے تو تم بھی اس قصور میں برابر کے حصہ دار ہو۔

نفیس : (ایک سرد آہ بھر کر اُٹھ جاتا ہے)

عذرا : دیکھو اب جانے دو۔

نفیس : میں ہنس نہیں سکتا جبکہ میرا دل رو رہا ہے۔ محلہ والوں نے ہمارے خلاف ایک سازش کر رکھی ہے۔

عذرا : آج کی سازش ہے وہ۔ دو مہینے ہمیں یہاں آئے ہو گئے۔ تب سے یہ باتیں ہو رہی ہیں۔

نفیس : تمہارے خیال میں تو صرف باتیں ہو رہی ہیں۔

عذرا : اور تمہیں تو کیا ہو رہا ہے؟

نفیس : چہ میگوئیوں کی حد سے گزر کر محلے کے معتبر آدمیوں نے ایک جلسہ کیا ہے جس میں یہ طے پایا ہے کہ ہمیں یہاں سے چلے جانے کا مشورہ دو یا جائے۔

عذرا : (گھبرا کر) سچ؟

نفیس : اور تو کیا میں آپ بیٹھا کہہ رہا ہوں۔

عذرا : نہ جائیں تو وہ کیا کریں گے؟

نفیس : کوئی ایک طریقہ تھوڑا ہی ہے تنگ کرنے کا۔ وہ کئی طریقوں سے ہمیں پریشان کر سکتے ہیں۔

عذرا : مثلاً..

نفیس : مثلاً... مثلاً... وہ حاکمان شہر کو تنگ کا پتہ کر سکتے ہیں کہ اس مکان میں درپردہ فحاشی ہوتی ہے، جو شادی کا کوئی گاہک آئے تو وہ پولیس کی معرفت ہمارا پکڑوا سکتے ہیں۔ وہ ہمارا حقہ پانی بند کر سکتے ہیں۔

عذرا : حقہ پانی کی تو میں پروا نہیں کرتی۔ ہاں ــــ دوسری باتیں البتہ... لیکن تمہیں ان باتوں سے لڑنا چاہیے۔ میں تمہیں مالی کمی تو لاکن ایسا اچھا موم کی ناک ہے کہ ان کی مرضی کے مطابق.......

نفیس : دماغ میرا بھی ان باتوں کو قبول نہیں کرتا لیکن جب ٹھنڈے دل سے غور کرتا

ہوں تو اسی نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ اگر دفتر والوں تک کبھی یہاں کی باتیں پہنچ گئیں تو میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا . . . . کتنے آدمی ہوں گے جو سمجھیں گے کہ یہ شریف انسان ہے۔ زیادہ تعداد اُن آدمیوں کی ہوگی جو یہی سمجھیں گے کہ اپنی بیوی سے . . . . .

عذرا : بس چپ رہو، . . . . کسی طرح یہاں سے نکل جاؤ۔ خواہ ہمیں کسی چھپر کھٹ کے نیچے ہی کیوں نہ رہنا پڑے۔

نفیس : ہاں، میں چلا جاؤں گا۔ میں اپنی عزت کے لیے لڑوں گا نہیں۔ شور نہیں مچاؤں گا میں شریف انسان ہوں تم جانتی ہو جب ہم نئے نئے اس مکان میں آئے تھے تو اس روز ایک طالب علم ——— کیا نام ؟ ——— نام یاد نہیں رہا۔ بہر حال ایک طالب علم شادو سے ملنے آیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ شریف آدمی اپنی بیٹی کی بے حرمتی دیکھ کر کبھی عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹاتے ——— بس اس کے الفاظ میں آدمی کی جگہ خاوند اور بیٹی کی جگہ بیوی کر لو ———

عذرا : اُس شرابی چھوکرے کی باتوں پر جاتے ہو ؟

نفیس : باتیں بڑی کام کی کرتا تھا وہ شرابی چھوکرا۔

عذرا : اپنی عزت کو بچانے میں دامن پر جو داغ لگ جاتے ہیں وہ مبارک ہیں۔ تم زیادہ پروا نہ کرو۔ آؤ میں تمھیں کچھ سناؤں، جی بہل جائے گا ذرا . . . .

نفیس : گویا پڑوسیوں کو اس بات کا ثبوت دیں ——— یہاں یہی دھندا ہوتا ہے

عذرا : آگے سے، اور تو کیا یا سکتا، گھٹ کے مر جائیں۔

(دائیں طرف سے آتی ہے اور اسے پکڑتی ہے)

. . . . . [illegible] جلال آکو کوئی بات

[illegible]

عذرا : کوئی نہ ہو ــــ خدا جو ہمارے ساتھ ہے۔
نفیس : خدا بہت دور کی بات ہے . . . . عذرا، ٹھہرو ــــ یہ آواز کدھر سے
آرہی ہے؟
(کھڑکی سے باہر دو آدمی باتیں کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کی شکلیں
بھی دھندلی دھندلی نظر آتی ہیں)
بنواری : دیکھ لو، میں نہ کہتا تھا۔ صاف آواز آرہی ہے۔ اندر کوئی آدمی بھی ہے۔
مرزا شوکت : ہاں اور کوئی ساز معلوم ہوتا ہے ستار کے موافق۔
بنواری : میں نہ کہتا تھا ــــ ان کا یہاں ہونا ہمارے محلے کی بہو بیٹیوں کے لیے
بہت خراب ہے۔ مشکل سے شادو کو یہاں سے نکالا تھا . . . . (وقفہ)
(وقفہ)
نواب کیا ارادہ ہے؟
مرزا شوکت : میرے خیال میں اندر چل دو ــــ جو روکا تو محلّے کے نام پر شور
مچا دیں گے اور جو نہ روکا تو ہمارا کام بنا بنایا ہے ــــ عورت اچھی معلوم ہوتی
ہے۔ تم نے اس دن اسے لفافہ خریدتے ہوئے دیکھا تھا!
(مل کر ہنستے ہیں)
مرزا شوکت : اب کرو ذرا ہمت . . . . .
(نفیس یہ باتیں سن کر کھڑکی کی طرف آتا ہے)
نفیس : خبردار کسی نے کھڑکی پہ آنے کی کوشش کی، یہاں اب نہ شادو رہتی ہے
اور نہ ایسی کوئی عورت۔
بنواری : (آہستہ سے) صاحب! ہمیں کوئی شادو سے کوئی خاص وہ نہیں ہے۔
مرزا شوکت : ہم تو دو گھڑی . . . . .

نفیس : میں کہتا ہوں یہاں سے بھاگ جاؤ ـــــ اب شادو کی جگہ یہاں گرہستی ہے اور ان کے متعلق آپ کا اندازہ سراسر غلط ہے۔

بنواری :- چلو یار ـــــ چل دو ـــــ جانے کیا مصیبت ہے۔

مرزا شوکت : یونہی چل دیں ؟ اس محلے میں چراغ تلے اندھیرا ہم نہیں دیکھ سکتے۔ بلکہ ہم کل امام صاحب کو بھی ساتھ لے لیں گے۔ پھر دیکھیں گے یہ لوگ کس طرح محلے میں رہ کر بدکاری کر سکتے ہیں۔

(کچھ سوچ کر)

لیکن یار تم تو یونہی ڈر گئے ـــــ جتنا یہ آدمی اچھل اچھل کر آتا ہے مجھے اتنا ہی دال میں کالا معلوم ہوتا ہے۔ یہ ان لوگوں کا ڈھنگ ہوتا ہے اور میری بات سنو (کان میں کچھ کہتا ہے جو نفیس اور عذرا کو سنائی نہیں دیتا)

نفیس : بے ہودہ لوگ ہیں ـــــ کب تک ان کی باتیں سنے جائے آدمی ؟

عذرا : میں کہتی ہوں سن کر بھی کچھ نہیں سننا چاہیے۔ کسی کا منہ تھوڑے باندھا جاتا ہے چپکے سے سو جاؤ۔

نفیس : ہاں سو جاؤ۔

(آہستہ آہستہ دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے)

لیکن یہ سوتے ہوئے زنجیر ہلا رہا ہے کوئی۔

عذرا : وہی لوگ ہوں گے ـــ ـــ اور ہوا کریں

نفیس : ہاں سو جاؤ۔

عذرا : لیکن ـــ ـــ مجھے نیند نہیں آتی۔

نفیس : تمہیں فکر کس بات کی ہے۔ جو کہنا ہے تمہارے پاس نہیں ہے۔ کواڑ بند ہیں۔ ادھر کھسیا کر چلے جائیں گے۔

عذرا : خود تو مرے پھیں، ہمیں ناحق پریشان کرتے ہیں —— جب تک چلے نہ
جائیں مجھے تو نیند نہیں آنے کی۔

نفیس : جو تمہارا مطلب ہے کہ فساد بپا کیا جائے تو میں اس کے حق میں نہیں ہوں۔
البتہ اصرار کرو گی تو سر پھٹول کے لیے تیار رہوں۔ (اٹھنا چاہتا ہے)

عذرا : نہیں نہیں —— پڑے رہیے چپکے سے۔ میں تو یونہی کہہ رہی تھی کہ مجھے
نیند نہیں آ رہی۔ آپ تو سارا دن دفتر میں کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں،
آپ سو جائیں۔ (کچھ دیر بعد ڈر کر)
میں کہتی ہوں جی —— کواڑ ہل رہے ہیں۔ جیسے کھل گئے ہیں!

نفیس : —— ہیں —— سنو! قدموں کی آوازیں آ رہی ہیں گویا کوئی ڈیوڑھی
میں کھڑا ہے یا . . . . اندر چلا آ رہا ہے —— (بلند آواز میں) —— کون ہے!

مرزا شوکت : ہم ہیں صاحب —— آپ کے محلے دار بنواری لعل اور مرزا شوکت۔

نفیس : آپ کیسے اندر چلے آئے؟ آپ کو یہاں آنے کی کس نے اجازت دی؟

بنواری : (گھبرا کر) ہم کیسے اندر چلے آئے؟ ہم یونہی چلے آئے اندر۔
(کھسیانی سی ہنسی ہنستا ہے)

مرزا شوکت : ہم آپ کے پڑوسی ہیں نہیں اور ہماحب ان نے بھیجا ہے۔

نفیس : لیکن یہ کون سا وقت ہے یہاں آنے کا —— ؟ اور میرے خیال میں دروازہ
بند تھا جس کا مطلب ہے آپ دروازہ توڑ کر داخل ہوئے ہیں۔
(عذرا سہمی ہوئی نظر آتی ہے)

بنواری : ہم نے دروازہ توڑا نہیں —— بس دھکیلا ہی تھا کہ وہ باہر آ گیا۔ بات
یہ ہے، کہ پرانے کواڑ . . . .

نفیس : آپ محلے دار ہوتے تو ہرگز ایسا نہ کرتے۔ آپ یقیناً چور ہیں —— اور

مداخلت بیجا کر رہے ہیں ــــــ آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اس وقت کسی شریف آدمی کے مکان پر اجازت کے بغیر چلے آئیں میں نے کھڑکی سے آپ کی گفتگو سن لی تھی ...... میں ایک سرکاری ملازم ہوں اور اپنی بیوی کے ساتھ یہاں رہ رہا ہوں۔ میری بیوی ایک گرہستن ہے کوئی بھگائی عورت نہیں، داشتہ نہیں (قریب پڑی ہوئی ایک لاٹھی اٹھا لیتا ہے) یہاں سے فوراً چلے جائیے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔

بنواری: (ڈرتے ہوئے) دیکھیے صاحب ہم یوں چلے جائیں گے لیکن آپ کی دھمکی سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔

مرزا شوکت: بابو صاحب ــــــ ہم سب معاملہ سمجھتے ہیں (ذرا درشت لہجہ میں) آپ نے بہو بیٹیوں والے محلے میں یہ اڈا بنا رکھا ہے۔ محلے والے سب آپ کو جانتے ہیں۔ آپ ایسا ہر آدمی یوں اپنے آپ کو گرہستی ہی کہتا ہے۔

عذرا: (گھبرائے ہوئے) اللہ مارو! اللہ کے قہر سے ڈرو! ہم گرہستی لوگ ہیں ہمیں یوں تو بدنام نہ کرو...... تم لوگوں کی بھی کوئی ماں ہوگی، بہن ہوگی ــ اندازہ کرو اگر کوئی......

مرزا شوکت: اجی ہم خوب سمجھتے ہیں یہ باتیں ــــــ

بنواری: ہم یہاں تھوڑی دیر بیٹھنے کے لیے آئے تھے اور ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہ تھی۔

نفیس: میں کہتا ہوں ــــ یہاں سے نکل جاؤ۔ ورنہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔

عذرا: (نفیس کو روکتے ہوئے) خدا کے لیے ــــ پروردگار کے لیے......

بنواری اور مرزا شوکت: پہلے یہ لاٹھی رکھ دیجیے ــــ پھر ہم سے بات کیجیے۔

(ڈیوڑھی کی طرف سے پولس انسپکٹر مائیکل اور ایک کانسٹیبل داخل

ہوتے ہیں)

سب انسپکٹر مائیکل : ٹھہر جاؤ ـــــ رک جاؤ ـــــ تم سب لوگ حراست میں ہو۔

نفیس : (لاٹھی چھوڑ کر) مدد ـــــ مدد، میں کہیں کا نہ رہا انسپکٹر صاحب (تقریباً روتے ہوئے) میں منہ دکھلانے کے قابل نہیں رہا، مجھے اور میری بیوی کو حراست میں لے لیجیے ـــ ہم دونوں آپ کی حراست میں آزادی سے اچھے رہیں گے۔

عذرا : میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں انسپکٹر صاحب (جھکتی ہے) ہمیں اس مصیبت سے بچا لیجیے ـــ ہم بے گناہ ہیں ــــــــ

سب انسپکٹر مائیکل : دیکھیے ـــ آپ خاموش رہیے، میرے پاؤں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔

کانسٹبل : یہ سب عیّاری ہے، انسپکٹر صاحب ـــــ ان سے پوچھیے کہ یہ آدمی کون ہیں ؟

سب انسپکٹر مائیکل : پوچھنے کی کیا ضرورت ہے، وہ تو صاف ظاہر ہے۔ آج تک میں نے کسی مجرم کو . . . . .

نفیس : (وحشیانہ انداز میں) کون مجرم ـــ ؟ انسپکٹر صاحب، میں مجرم ہوں، اور میری بیوی ؟ . . . .

سب انسپکٹر مائیکل : نفیس صاحب آپ ہی ہیں ؟

مرزا شوکت : جی ہاں، یہ انھی کی نفاست ہے۔

سب انسپکٹر مائیکل : آپ چپ رہیے۔

نفیس : نفیس میرا ہی نام ہے ــــ لیکن میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کی رو سے میں مجرم گردانا جاؤں۔ یوں جیسا کہ میں نے عرض کیا، آپ کی قید

میں آنے کے لیے تیار ہوں۔

بنواری: جھگڑے کی نوبت یہی ہے جناب کہ بہو بیٹیوں کے اس محلے میں . . . .

سب انسپکٹر مائیکل: یکومت! ان باتوں کو میں تم لوگوں سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ یہ درست ہے کہ ان لوگوں نے اس مکان کو فحاشی کا اڈا بنا رکھا ہے۔ لیکن آپ اس وقت یہاں کیسے تشریف لائے؟ کیا آپ دن کے وقت ان لوگوں کو اخلاق کا سبق نہیں پڑھا سکتے تھے؟

نفیس: فحاشی کا اڈا — یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

مرزا شوکت: دن کے وقت؟ — یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ ہم لوگ دن بھر اپنے کام دھندے میں مشغول رہتے ہیں۔

کانسٹیبل: دن کے وقت محلے دار انھیں کس طرح پکڑ سکتے ہیں؟

سب انسپکٹر مائیکل: اگر اس کمرے میں محلے داروں کے علاوہ کوئی اور شخص ہوتا جس کی بابت ان لوگوں کو تفصیلات نہ پتا ہوتیں تو یہ لوگ مجرم ٹھہرتے۔ اب یہ محلے دار خود ہی ثبوت ہیں کہ اندر پہلے آگئے ہیں اور بداخلاقی کے مرتکب ہو رہے ہیں — —

نفیس: جناب والا — میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں

عذرا: ہائے میرے اللہ! . . . . .

سب انسپکٹر مائیکل: (نفیس اور عذرا سے) میں آپ سے بات کرتا ہوں —

(بنواری سے) آپ کا نام کیا ہے؟

بنواری: (ادھر ادھر دیکھ کر) میرا نام — لیکن میں تو . . . . .

سب انسپکٹر مائیکل: میں آپ کو کوئی سزا نہیں دے رہا ہوں — میں صرف نام پوچھ رہا ہوں اور آپ اتنا گھبرا رہے ہیں۔

بنواری لعل : میرا نام ہے ...... بنواری لعل ہے !

سب انسپکٹر مائیکل : (مرزا شوکت سے) آپ کا اسم گرامی ؟

مرزا شوکت : لیکن انسپکٹر صاحب، ہمارا گناہ کیا ہے ؟ طوائف کے دروازے تو خلقِ خدا کے لیے کھلے ہوتے ہیں۔ جو ہم اندر چلے آئے تو کیا جرم کیا ــــ ؟

سب انسپکٹر مائیکل : خوب ! ــــ یہ خلقِ خدا کے الفاظ کا بھی خوب استعمال ہوا ــــ لیکن صاحب آپ تو محلے دار کی حیثیت سے تشریف لائے تھے تاکہ یہ اڈّا اٹھوا کر محلے کے لوگوں کی بہو بیٹیوں کی آبرو بچائی جائے ــــ

مرزا شوکت : (گھبرا کر) نہیں، میرا مطلب ہے ....

سب انسپکٹر مائیکل : آپ اپنا نام بتائیے ؟

بنواری لعل : (ڈرتے ہوئے) آپ کا نام مرزا شوکت ہے !

(مرزا شوکت غصّے سے بنواری لعل کی طرف دیکھتے ہیں)

مرزا شوکت : لیکن انسپکٹر ــــ میں کیا ڈرتا تھوڑے ہی ہوں ، ابھی امام صاحب نے سمجھایا تھا کہ اس بات کی تحقیق کی جائے۔

سب انسپکٹر مائیکل : چلیے اس بات کی تصدیق بھی ہو جاتی ہے۔ (کانسٹیبل سے)

سردار حسین ! انھیں باہر لے جاؤ تاکہ دوسرے محلے داروں کے ساتھ ان کو بھی گواہیاں پیش کی جائیں۔

مرزا شوکت : لیکن ایک بات کا خیال رکھیے گا، ہم باعزت شہری ہیں اور ...

سب انسپکٹر مائیکل : جی ہاں، میں خوب جانتا ہوں، آپ تشریف لے جائیے۔

(کانسٹیبل بنواری اور مرزا شوکت کو باہر لے جاتا ہے)

(نفیس سے)

نفیس صاحب ! آپ کے آبائی گھر کا پتا میرے پاس ہے۔ آپ نے پہلے بھی چھوڑ دیا

ڈکشن میں رہتے تھے وہاں تفتیش کی جا چکی ہے۔ اس جگہ آپ کب سے رہ رہے ہیں؟

نفیس : عرصہ دو ماہ سے۔

سب انسپکٹر مائیکل : نہیں، آپ کو غالباً یہاں آئے دو ماہ اور چودہ دن ہوتے ہیں۔

عذرا : جی ہاں، بس اتنے ہی دن ہوتے ہیں۔

سب انسپکٹر مائیکل : (نفیس سے) جب آپ یہاں آئے تو آپ کو پتا نہیں تھا کہ اس مکان میں شمشا د بائی طوائف رہتی تھی؟

نفیس : نہیں صاحب! میں بنا جانے بوجھے اسباب اٹھوا کر ادھر چلا آیا، تب سے ہر روز یہی قصہ ہوتا ہے، کوئی نہ کوئی ہمارا دروازہ کھٹکھٹاتا ہی رہتا ہے اور محلے والوں کو ہم پر شک کرنے کا موقع دیتا ہے ——— اور یہ چپقلش جاری ہے۔

سب انسپکٹر مائیکل : چپقلش سے آپ کا کیا مطلب ؟

نفیس : یہی ——— نیا مکان تلاش کرنے اور نہ ملنے کی اور بنواری اور مرزا ایسے لوگوں کے ساتھ جھگڑنے کی۔ آج تک میں یہی سمجھتا رہا تھا کہ ہمیں اپنے ہی گناہوں کا حساب دینا ہوتا ہے، لیکن نقل مکانی کے اس تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ انسان اپنے بچوں، اپنے ماں باپ، بھائی بہن، بیوی کے کردار کا ہی ذمے دار نہیں ہوتا، بلکہ اپنے پڑوسیوں کے قول اور فعل کے لیے بھی گردن زدنی ہے۔

عذرا : تمام دن ہمارا دروازہ بند رہتا ہے ——— ہم ڈر کے مارے کواڑ کھولتے ہی نہیں۔ آپ کواڑ دیکھ کر پتا کر لیجیے کہ یہ لوگ دروازہ اکھاڑ کر اندر آ گئے ہیں یا نہیں ——— ہم اور کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے ——— جتنا ہم زیادہ بولتے ہیں اتنے ہی گنہگار معلوم ہوتے ہیں

اگر آپ بھی ہمیں قصوروار سمجھتے ہیں تو جو سلوک آپ چاہیں کریں ———

سب انسپکٹر مائیکل : آج کا واقعہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ——— میں سب معاملے کی جانچ پڑتال کر چکا ہوں، آپ بے حد شریف ہیں اور یہی آپ کا جرم ہے ——— (نفیس سے) آپ کل تھانے میں تشریف لائیے نفیس صاحب اور نیک چلنی کی ضمانت داخل کیجیے ———

نفیس : نیک چلنی کی ضمانت ؟

عذرا : نیک چلنی کی ضمانت! . . . . (رو کر) میرے اللہ!

نفیس :- انسپکٹر صاحب . . . . . مجھے بدچلن ہی سمجھ لیجیے۔ لیکن میں نیک چلنی کی ضمانت داخل نہیں کر سکوں گا، اس سے پہلے رشتہ داروں میں یہ بات نہیں پھیلی پھر اُن میں بھی پھیل جائے گی۔ آپ مجھے گرفتار کیوں نہیں کر لیتے ؟ میں حاضر ہوں (دونوں ہاتھ بڑھا دیتا ہے) میرے پاس کوئی ضامن نہیں اس محلہ میں میرا کوئی واقف نہیں، کوئی ہمدرد نہیں۔

(عذرا بدستور رو رہی ہے)

سب انسپکٹر مائیکل : آپ سمجھتے نہیں ہیں ——— صرف ایک کاغذی کارروائی مکمل کرنی ہے۔ اگر کوئی ضامن نہ ملا تو میں آپ کو مہیا کر دوں گا۔ آپ محلے والوں سے ڈریں نہیں . . . . . . میں آپ کی پوزیشن کو خوب سمجھتا ہوں مجھے آج سے اپنا ہی سمجھیے۔

نفیس : یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں انسپکٹر صاحب ؟ ——— ہم آپ کے قابل نہیں ہیں۔ آپ نہیں جانتے ہم آپ کے کتنے ممنون ہیں . . . .

سب انسپکٹر مائیکل : آپ خوف نہ کھائیے۔ میں ہر طرح سے آپ کی مدد کرنے کو تیار ہوں . . . . (عذرا سے) میری بیوی بھی آپ کی طرح گانے بجانے کا شوق ن

رکھتی ہے (نفیس سے) کیا آپ دونوں پیر کے روز میرے ساتھ چائے پی سکتے ہیں ؟

عذرا : ہم آپ کے بہت شکر گزار ہیں ——— آپ ان محلے والوں سے ہماری خلاصی کروا دیجیے۔ آپ کو بہت بڑا ثواب ہوگا.... مجھے خود آپ کی بیگم صاحبہ سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا ہے! آپ جب چاہیں گے ہم آپ کے گھر پہنچ جائیں گے۔

سب انسپکٹر مائیکل : (قدرے گھبرا کر) چائے گھر پہ ممکن نہیں ہو سکے گی.... دیکھیے نا ذرا میری بیوی بیمار رہتی ہیں، چائے باہر پی سکیں گے کہیں.... پھر سیر تماشا ہو جائے گا، بہرحال ——— میں عرض کروں گا کل آپ تھانے تشریف لا رہے ہیں نا؟ ——— میں چلتا ہوں ——— خدا حافظ!

(جاتا ہے)

[illegible] : ہاں ہاں، میں کل صبح حاضر ہو جاؤں گا.... خدا حافظ!

(وقفہ)

نہایت ملنے کی خواہش ہے! ——— چائے کی دعوت! کہیں اس سے بڑا گڑھا تو نہیں کھود رہا؟

عذرا : میں کیا کر جاؤں؟ ——— ——— یا اللہ!

(پردہ)

تیسرا منظر

وہی کمرہ جو پہلے منظر میں نظر آتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اب سب چیزیں قرینے سے رکھی ہیں۔ کونے میں طنبورا پڑا ہے۔ تپائی پر ایک نفیس پاندان رکھا ہے جس کے قریب گھنگرو پڑے ہیں۔ عذرا اس وقت کچھ کپڑے صندوق میں ڈال رہی ہے۔ کپڑے ڈالنے کے بعد وہ صندوق کو چارپائی کے نیچے ڈھکیل دیتی ہے تاکہ جگہ اور کشادہ ہو جائے۔ نفیس ایک کھڑکی کے پاس بیٹھا ہے کبھی کبھی بازار میں جھانک لیتا ہے گویا کسی کے آنے کا منتظر ہے۔

عذرا : اب بالکل سر پہ آگئی تمہاری بھانجی کی شادی ——

نفیس : ارے ہاں! . . . . میں تو بالکل غافل تھا —— کب بیاہی جا رہی ہے نصیرہ؟

عذرا : ہفتہ ہفتہ آٹھ آٹھ اور آٹھ سولہ اور تین دن اوپر —— آج سے بیسویں روز شادی ہے۔ بلاوے پہ بلاوا آ رہا ہے اور تمہیں کوئی خبر ہی نہیں۔

سوچ

نفیس : تم نے یہ بتا کر مجھے فکر میں مبتلا کر دیا۔

عذرا : تین سے کم جوڑے دو گے تو عزت نہیں رہے گی اور ایک سوٹ دولہا کے لیے۔ کہیں جا کر دس برس سے ماموں کما رہا ہے اور اتنا بھی نہ ہوا جو بھانجی کو جوشن ہی بنوا دیتا۔

نفیس : دو جوڑے، ایک سوٹ اور پھر ایک جوشن —— یہ کیا بات کر رہی ہو تم؟ ہم مسلمانوں میں . . . .

عذرا : میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ ہم ٹھیک مسلمان ہیں لیکن راجپوت ہونے کی وجہ سے ہماری تمام رسمیں تو ہندوانہ ہیں نا۔

نفیس : میں کوشش کر رہا ہوں عذرا لیکن دیکھنے والے اندھے ہیں کیا؟ تمہارے اپنے پہننے کو کپڑا نہیں ہے اوپر سے سردیاں منہ پھاڑے آ رہی ہیں۔ مجھ سے تو جو ہوگا بنوا دوں گا۔

عذرا : یہ تو ٹھیک ہے لیکن اس سے کم میں عزت نہ رہے گی، کہے دیتی ہوں، آپا کہیں گی ــــ بھائی کا بیاہ کب روز روز ہوگا، اس سلسلے میں تو ہمیں تھوڑے بہت اُدھار سے بھی نہیں ڈرنا چاہیے۔ ... بہت نہیں تو گزارے موافق ہی سہی۔

(وقفہ)

نفیس : دیکھو، میں کچھ انتظام کرتا ہوں ... ... دراصل میں تمہارے متعلق ایک عرصے سے سوچ رہا تھا۔

عذرا : میرے متعلق مت سوچو ــــ میرا تو گزارا ہو ہی رہا ہے۔ میں کہتی ہوں تم بھی بھلا دفتر کے دوسرے لوگوں کی طرح کیوں نہیں ہو جاتے؟ ... اس تنخواہ میں گزارا تو ہونے سے رہا۔ کبھی کبھار پیسے لے لینے سے کیا ہو جاتا ہے۔ ــــ پیغمبری بھی تو سو گناہوں کا گناہ ہے۔

نفیس : رشوت کے نام پر جیسے اسرافیل کا صور سنائی دینے لگتے ہو، وہ کیا کرے۔ ہم کو مر کر بھی خدا کو جواب دینا ہے۔

عذرا : تمہارا کیا خیال ہے، باقی سارا دفتر تمہاری طرح ہی ہے؟ وہ لوگ آخر کیا جواب دیں گے [illegible] وہ [illegible] کہ وہ تم کبھی [illegible] لیتا ــ [illegible] سارا [illegible] تو [illegible] کام [illegible] کیا تو [illegible] لگا یا

کسی کو ———

نفیس : ہاں عذرا ! میں تم سے پہلے اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا۔ بلکہ میں نے ٹھیکیدار عرفانی کو گانٹھ بھی لیا تھا ——— اس نے یہاں چھ بجے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن اس وقت ساڑھے چھ بجے ہیں اور اس کی شکل تک نظر نہیں آتی۔

عذرا : (قدرے آسایش کے احساس سے) کتنے پیسوں کی اُمید ہے ؟

نفیس : یہی سات آٹھ سو کی ——— ارے ایک ملبہ کا ٹھیکہ تو ہے۔ کہیں بڑے صاحب سے براہِ راست نہ لے لے۔ میں نے پہلے تمھیں نہیں بتایا کہ کہیں تم مجھے بُرا بھلا نہ کہو۔ بلکہ مجھے یہ فکر دامن گیر تھی کہ تمام بات کھل جانے پر میں تمھیں کیا مُنہ دکھاؤں گا ——— کچھ تمھیں حیران کر دینے کا ارادہ بھی تھا . . . . اب تم خود ہی اس کی تائید کر رہی ہو۔

عذرا : (کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے) کس قسم کا آدمی ہے ؟ ——— ٹھہرو میں دیکھتی ہوں۔

نفیس : یہی دُبلا پتلا سا آدمی ہے ——— لوکی سے سر پر ایک ڈھیلی ڈھالی ڈگمگاتی ہوئی ہیٹ پہنتا ہے۔ اس کی پہچان یہ ہے کہ پاجامے کے ساتھ ہیٹ

عذرا : (کھڑکی میں سے جھانکتے ہوئے) ابھی تک تو دُور گلی کے اس سرے تک بھی کوئی نظر نہیں آ رہا ———

نفیس : (سوچتے ہوئے) عذرا ! تمہاری اس تائید کے بعد ایک قسم کی تسکین تو ضرور ہو گئی ہے، لیکن مجھے ایک طرح کا رنج بھی ہوا ہے !

عذرا : (ہنستے ہوئے) لیکن تم ساری زندگی اسی قدر رشتہ [illegible] مجھے
[illegible]
[illegible]

ہے . . . . ابھی کل ہی اماں باڑے کی ایک عورت سے میری لڑائی ہوئی۔ اس نے جو کچھ کہا ـــــ الٰہی پناہ! اللہ دے اور بندہ لے۔ لیکن اب تو یہ باتیں دل پر اثر ہی نہیں کرتیں . . . . (پان لگاتے ہوئے) یہاں آ کر ہمیں بھی پان کھانے کی عادت ہو گئی ہے۔

نفیس: (پان لیتے ہوئے) تم نے تو مجھے بتایا ہی نہیں عذرا!

عذرا: کیا نہیں بتایا؟

نفیس: یہی لڑائی کے متعلق۔

عذرا: تم دفتر سے تھکے ماندے آتے ہو ـــــ میں نہیں چاہتی میں تمھیں اس قسم کی باتیں سنا کر پریشان کروں۔ اور وہ عورت تو خود محلے بھر میں مشہور ہے۔ پہلے پہل لوگوں نے اس کے متعلق واویلا کی لیکن جب اس نے سب کی ماں بہن کو دھر لیا تو سب چپ ہو گئے ـــــ اب کوئی اس سے الف سے ب تک نہیں کہتا . . . .

نفیس: یہ ہم ہی ہیں جنھوں نے سب کچھ شرافت سے سن لیا ہے ـــــ اور اس لیے انھیں ہمارے منہ آنے کا موقع بھی مل گیا۔

عذرا: (کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے) ٹھہرو گلی میں کوئی آ رہا ہے ـــــ کہیں یہ عرفانی . . . . . .

نفیس: میں دیکھتا ہوں۔ (کھڑکی کی طرف جاتا ہے)
اوں ہوں ـــــ یہ تو کوئی کبوتر باز ہے۔ دونوں ہاتھوں میں کبوتر تھامے اور رنگا رنگ شاہی جوتا پہنے جا رہا ہے۔ حمیدو کا بیٹا ہے ـــــ حمیدو پہلوان کا . . . . (وقفہ)
اب تو کافی دیر ہو گئی عرفانی نے کہا تھا جو میں چھ بجے تک پہنچ گیا تو بہتر

ورنہ نہیں آؤں گا (مایوسی سے) شاید بڑے صاحب سے مل لیا ہو۔
عذرا : (مایوسی سے) ہاں شاید بڑے صاحب سے مل لیا ہو۔ پیسا ہماری قسمت میں نہیں۔
نفیس : تو اب کیا ہوگا ــــ؟ نصیرہ کی شادی پہ.....
عذرا : (منہ لمبا کرتے ہوئے) تو گویا اب وہ نہیں آئے گا؟
نفیس : معلوم تو یہی ہوتا ہے ــــ اچھا اگر وہ کل دفتر میں مجھ سے ملنے آیا تو میں ٹھینگے سے انکار کر دوں گا۔ صاف کہہ دوں گا میں نے ٹھیکہ وکرم سنگھ کو دے دیا ہے۔
عذرا : یہ وکرم سنگھ کون ہے؟
نفیس : وہ دوسرا ٹھیکیدار ہے۔
عذرا : وہ کچھ نہیں دے گا؟
نفیس : اگر عرفانی نے کچھ نہ دیا تو پھر میں وکرم سنگھ سے کچھ نہیں لوں گا۔ میں ہر ایک آدمی کو نہیں گانٹھ سکتا۔ اس سے میری نوکری خطرے میں پڑ جاتی ہے اور خود میں بھی.....
عذرا : ہاں یہ بات درست ہے۔
نفیس : اچھا تو وہ کون تھی اماں باڑے والی عورت؟
عذرا : اجی وہی قاضی صاحب کی دوسری بیوی تھی۔ گز بھر کی لمبی زبان والی خود گھر گھر جھانکتی پھرے اور میرے منہ آئے ــــ میں کیا پروا کرتی ہوں؟
نفیس : تم نے کچھ سنا دی ہوتیں۔
عذرا : اور تو میں کیا کم کرتی ہوں ــــ اب نہیں میں ڈرتی کسی سے!
(دروازے پر دستک سنائی دیتی ہے)

لو، تمھارے عرفانی آگئے ——— ٹھہرو، میں کھڑکی میں سے دیکھتی ہوں۔

نفیس : نہیں نہیں میں جاتا ہوں۔ (جاتا ہے)

عذرا : یہ تمھارا عرفانی نہیں ہے ——— یہ تو کوئی اور ہی ہے موٹا سا آدمی ——— سیاہ چشمہ لگائے ہوئے۔

نفیس : (دروازے میں رک کر) ہیں! ——— ٹھہرو، میں خود دیکھتا ہوں (جاتا ہے)

عذرا : جانے یہ کون بلا آ گئی پھر... ہاں، شاید عرفانی نے اپنا کارندہ بھیجا ہو لیکن شکل سے تو کارندہ نہیں دکھائی دیتا ——— اوہ! یہ چادر کس قدر میلی ہے!

(اٹھ کر کمرے کو درست کرنے لگتی ہے، جلدی جلدی ایک صاف چادر بچھا دیتی ہے۔ کچھ دیر بعد نفیس گھبرایا سا داخل ہوتا ہے)

نفیس : ارے بھئی یہ کوئی اور ہی صاحب ہیں، سیٹھ شیو ہرت نام ہے۔

عذرا : عرفانی کے کارندے نہیں؟

نفیس : نہیں ——— کہتے ہیں کہیں برس ایک کے بعد آتا ہوں۔

عذرا : اس شہر میں؟

نفیس : ہاں ——— اور شادو کے یہاں ...

عذرا : تو آپ نے انھیں بتا دیا ہوتا.....

نفیس : (وقفہ) ——— (کچھ عجیب سا انداز میں) میں کہتا ہوں .....

عذرا : کہو ———

نفیس : ادھر لیے آؤں ——— دوسرے کمرے میں بٹھا رکھا ہے انھیں۔

عذرا : ادھر کس لیے؟ ——— خدا کے لیے یہاں سے مکان تو پہلی کر دو... بے چارہ بچہ نکال دو۔

نفیس : اتنا امیر آدمی ہے، ہاں! اسے یوں ہی کیسے نکال دوں... (ڈرتے ڈرتے) [illegible]

چور تو نہیں ہے، اسے کچھ دیر عزّت اور تکریم سے بٹھاتے ہیں اس کے بعد چلا جائے گا۔

عذرا : تو بٹھا دو یہاں ــــ میں دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہوں ــــ اوّل تو تمھیں معلوم ہی ہے محلّے ہیں......

نفیس : تم ہی نے کہا تھا کبھی کبھار رشوت لینے سے کیا ہو جاتا ہے؟ یہ غریبی کبھی تو سو گناہوں کا گناہ ہے!

عذرا : اچھّا، تو یہ کبھی ٹھیکہ دار قسم کا آدمی ہے اور اس سے کبھی رشوت ممکن ہے؟

نفیس : نہیں، ایسی رشوت نہیں۔

عذرا : (گھبرا کر) تو پھر کیا ہے؟

نفیس : تم ہی نے تو کہا تھا "تم ساری زندگی اس قدر شریف رہے ہو، مجھے بتاؤ ــ تمھیں اس سے کیا حاصل ہوا؟" محلّے میں جو ہماری بدنامی ہوئی اس کے لیے ہماری شرافت ہی تو ذمے دار ہے۔

عذرا : تو پھر تمھارا مطلب کیا ہے؟

نفیس : (ڈرتے ہوئے) میں کہتا ہوں ــــ ایک گانا سنا دو سیٹھ صرف گانے کا شوقین ہے۔ سو ایک روپیا ہو جائے گا۔ گانا سنانے میں کیا حرج ہے؟

عذرا : یہ تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ ــــ لوگ کیا کہیں گے؟

نفیس : لوگ پہلے کیا کچھ نہیں کہتے ــــ اور پھر ابھی تم کہہ رہی تھیں، میں کسی سے نہیں ڈرتی ــــ آہستہ سے کچھ سنا دینا۔

عذرا : نہیں، میں کہتی ہوں تم [illegible]۔

نفیس : ارے یہ صرف گانا ہی تو ہے ــــ دیکھنا تم بے چارہ، ذرا اچھی طرح بیٹھنا آنا۔ (آواز [illegible] اور چلی جاتی ہیں)

شیو برت : آداب عرض کرتا ہوں ۔
عذرا : (سخت گھبراہٹ میں) آداب عرض ــــ آپ (کچھ سوچ کر تپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ادھر بیٹھ جائیے ۔
نفیس : (پلنگ کی طرف ہاتھ کرتے ہوئے) تشریف رکھیے ۔
شیو برت : (بیٹھتے ہوئے) کہیے مزاج اچھے ہیں؟ ..... (بغیر جواب کا انتظار کیے) سال میں ایک بار میں شمشاد کے یہاں آتا ہوں ــــ اب کے پتا چلا اس کی جگہ آپ تشریف رکھتی ہیں ــــ اور آپ ــــ آپ کے سازندے کہاں ہیں؟
نفیس : (مجرمانہ گھبراہٹ کے ساتھ) دراصل ان کی طبیعت اچھی نہ تھی اس لیے سازندوں کو رخصت کر دیا ۔

(طنبورا اٹھا کر عذرا کے ہاتھوں میں تھما دیتا ہے ... عذرا کانپتے ہوئے ہاتھوں سے طنبورا لے لیتی ہے)

لیکن اب جبکہ آپ تشریف لے آئے ....
عذرا : (گھبرا کر) میں نہیں گا سکوں گی ۔
نفیس : ــــ ذرا وہ سنا دو ــــ جلد آجا کہ جی ترستا ہے!

(عذرا بڑی کوشش سے طنبورا چھیڑتی ہے ۔ دروازے میں مراتب نمودار ہوتا ہے)

مراتب : (خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ) کے پان درکار ہوں گے سرکار کو؟

(پردہ گر جاتا ہے)

آج

زندگی : کیبرے " زندگی اور موت" میں موت کی اداکار۔ قوم کی امریکن ہے۔
موت : کیبرے " زندگی اور موت" میں موت کی اداکار۔ ایک خوبصورت، انگریز لڑکی۔
مینیجر : ریستوران کا مینیجر — ایک معمر انگریز جو اپنے بھاری چہرے کی وجہ سے چرچل معلوم ہوتا ہے۔
پروفیسر ٹھاکر : ایک ماضی پرست انسان جو اپنے آپ کو گاندھی سے کم نہیں سمجھتا۔
بلا نوش : امرت اور شنکر، ہندوستانی طالب علم جن میں شنکر کمیونسٹ ہے۔
صفدر آرٹسٹ : جو ایک گراموفون کمپنی میں ملازم ہے۔
بیرا — اور ہوٹل کے دوسرے مہمان۔

وقت : ۱۹۴۳ء جبکہ روزویلٹ کے ذاتی سفیر فلپس نے ہندوستان کے متعلق انکشافات کیے تھے اور مسٹر چرچل بہت سیخ پا ہوئے تھے۔

مقام : کسی پریزیڈنسی کا ایک بڑا ریستوران۔

پردہ اُٹھنے پر کیبرے "زندگی اور موت" دِکھائی دیتا ہے۔ حاضرین بڑے انہماک سے اس ناچ کو دیکھ رہے ہیں . . . 'زندگی' بھڑکیلا لباس پہنے ہوئے ہے اور موت نے ایک سیاہ غرغل اوڑھ رکھا ہے۔ 'موت'، 'زندگی' کا پیچھا کرتی ہے لیکن شوخ و شنگ زندگی بار بار طرح دے کر نکل جاتی ہے۔ آخر 'موت'، 'زندگی' پر چھا جاتی ہے۔

ناچ کے فوراً بعد تالیوں کے شور میں 'زندگی' اور 'موت' ایک طرف ہو جاتی ہیں، کچھ دیر بعد کیفے کے ایک کونے میں 'زندگی' لوگوں کی نظروں سے چھُپی ہوئی، مینیجر سے باتیں کرتی نظر آتی ہے۔

زندگی: اِس وقت کے بجے ہیں؟ مینیجر!

مینیجر: (اس نے نہیں سنا) ——— فرمائیے محترمہ!

بیرا: (آگے بڑھ کر) جی میم صاحبہ!

زندگی: (بیزاری سے) اُف میرے خدا! ——— معلوم ہوتا ہے، آج سب لوگ بہرے ہو گئے ہیں . . . میں پوچھ رہی ہوں، اس وقت کے بجے ہیں؟ (ہجوم کی طرف دیکھتے ہوئے) آدھی رات کا عمل ہے اور اس بے ہنگم ہجوم میں سے ایک بھی شریف آدمی اٹھتا نظر نہیں آتا۔

مینیجر: اوہ! تو گویا خاتون 'زندگی' اپنے آپ وقت نہیں دیکھ سکتیں؟

زندگی: میں اکثر مردوں کو خاتون نوازی کا موقع دیتی ہوں، مینیجر، اگرچہ کچھ مرد . . . خیر قصہ یہ ہے کہ میں اوٹ سے باہر نہیں آسکتی۔ دیکھتے نہیں میں نے ابھی تک

'زندگی' کا لباس پہنا ہوا ہے۔

منیجر: تو پھر کیا ہے؟

زندگی: اُوہو! تو پھر کوئی بات نہیں؟...... کیفے کی بتیوں میں جگمگانے لگے گا یہ لباس اور یہ سب تمھارے چینی کے برتنوں سے غافل ہو کر میری طرف دیکھنے لگیں گے۔

منیجر: ہاں، یہ ٹھیک ہے.... لیکن کوئی ایسا حرج بھی نہیں ہے (کلاک دیکھتے ہوئے) اس وقت بارہ بجنے میں چھ منٹ باقی ہیں۔

زندگی: (ہنستے ہوئے) خوب! گویا پانچ منٹ اور سینتالیس سیکنڈ نہیں (پھر ہنستی ہے)..... بہر حال... 'موت'!.... 'موت' نہ جانے کدھر چلی گئی ہے۔ آج کس خوبصورتی سے اس نے اپنے چمکتا ڈراپیے کالے کالے پر مجھ پر پھیلا دیے، کس انداز سے 'زندگی' پر جھپٹی اور آخر دم تک مجھ پر جھکی رہی۔ لوگوں نے تالیاں پیٹ پیٹ کر کان بھرے کر دیے ___ (طالبِ علموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) وہ ہندستانی طالبِ علم بہت چھوٹے.....

منیجر: (حسد سے) مجھے بھی خیال ہے انھوں نے میرے 'زندگی اور موت' پسند کیا ہے.... 'موت' نہ جانے کدھر چلی گئی ہے۔ ابھی وہ اُدھر کھڑی لباس تبدیل کرنے کے متعلق سوچ رہی تھی اس نے اپنے دو لمبے لمبے اور کالے ناخن علاحدہ نہیں کیے تھے......

بیرا: (دخل در معقولات) 'موت' کٹہرے کے قریب کھڑی ہے ڈرم کے پاس ___ میم صاحب! آپ فرمائیں تو.....

منیجر: (ڈانٹتے ہوئے) بیرا!

بیرا: معافی چاہتا ہوں حضور! (لوری سنبھالتا ہوا چل دیتا ہے)

زندگی : بیرا ! 'موت' سے کہہ دو 'زندگی' تمھارا انتظار کر رہی ہے (ہنستی ہے) کس قدر مضحکہ خیز ہے یہ بات ! 'موت ایکا ایکی کسی کونے سے نکل آئے گی۔ بالکل موت کی طرح ! ..... انسان زندگی میں موت کے سائے کو محسوس نہیں کرتا وہ نہیں جانتا ، اگلے ہی موڑ ، اگلے ہی نکڑ پہ کالی کلوٹی ، بھیانک موت ایک معمولی سے چھکڑے پر سوار ہو کر آ رہی ہے ـــــ اچانک چھکڑا اسے روند ڈالتا ہے۔

(ہندستانی طالب علموں کا شور سنائی دیتا ہے)

شنکر : ہمیں زندگی چاہیے۔

بلانوش : ایک چھوٹا اور ! ــــ میں اپنے آپ کو مار ڈالنا چاہتا ہوں ــــ مجھے موت کی ضرورت ہے۔

صفدر : (شراب کا پیگ اٹھا کر ناچتا ہے) ارے ہاں۔

بغل میں رہتی ہے بوتل کتاب کے بدلے
جو ہم نے مشق بڑھائی ہے بادہ خواری کی
بغل میں .....

زندگی : یہ کون لوگ شراب پی رہے ہیں ؟ ــــ شراب مانگ رہے ہیں کیا ؟ کیا بار ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے بند نہیں ہو جاتا ، نئے آبکاری قانون کے مطابق ؟

بیرا : (اس کے ہاتھ میں ٹرے ہے۔ لیکن وہ متوجہ ہو جاتا ہے) ــــ بند ہو جاتا ہے میم صاحب ! لیکن ......

مینیجر : شٹ اپ ، فول ! ('زندگی' سے) ہاں محترمہ ! معلوم ہوتا ہے آپ کہیں جانا چاہتی ہیں ، لیکن شاید بھول گئی ہیں ، آج ہفتے کی رات ہے۔ ان لوگوں کے علاوہ کراگرا

پلٹن کے آدمی بھی یہاں موجود ہیں اور آپ کو گاہکوں کی خاطر ابھی یہیں ٹھہرنا ہے
زندگی : میں نے جانے کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ میں صرف یہ پوچھ رہی ہوں، کیا یہ شور مچانے والے وہی نوجوان ہیں ......؟
منیجر : وہی ہندستانی طالب علم ہیں۔ سب کے سب پیے ہوئے ہیں اگرچہ بار ساڑھے بارہ بجے بند ہو جاتا ہے۔ لیکن یوں بے دریغ پیسے لٹانے والے گاہکوں کو ہم رد نہیں کر سکتے۔ کیا آپ ان کا ساتھ دیں گی یا خاتونِ 'موت'؟
زندگی : اوہ منیجر! مجھے تو ان کی کمسنی پر رحم آتا ہے! یہ بالکل نوعمر ہیں۔ شراب ان کے پھیپھڑوں کو چھلنی کر دے گی۔ ان کے دل اور دماغ کو ــــ بالکل ناکارہ بنا دے گی۔ مجھے یقین ہے، شباب و شراب نے انھیں پہلے ہی بے عمل بنا رکھا ہے
منیجر : شاید وہ سب طالب علم نہ ہوں، مثلاً اس آدمی کو میں جانتا ہوں جس کے ماتھے پر بالوں کا ایک بڑا سا گچھا ہے۔ وہ شاید کسی گراموفون کمپنی میں نوکر ہے۔ لیکن یہ ٹھیک ہے کہ ان میں سے کسی کی بھی عمر پچیس سال سے زیادہ نہیں۔ سب کھوئے کھوئے معلوم ہوتے ہیں، جیسے کسی کو پتا نہ ہو کہ اُسے کیا کرنا ہے (ہنستے ہوئے) ہمارے حق میں کس قدر اچھی بات ہے! دیکھو وہ پھر شور مچانے لگے ہیں!
پروفیسر ٹھاکر : تمھارا بیٹھنے کا طریقہ مجھے بالکل پسند نہیں، بلاتوش!
بلاتوش : (ہنستے ہوئے) گویا پروفیسر ٹھاکر ابھی تک اپنے آپ کو کلاس روم ہی میں سمجھتے ہیں۔
امرت : ٹانگیں کرسی کے بازوؤں پر رکھنا بدتمیزی ہے؟ ابھی تک آپ اخلاقیات میں الجھے ہوئے ہیں پروفیسر صاحب!
صفدر : یہ اخلاق کس بلا کو کہتے ہیں۔ مجھ سا دہقان اور پتھر کے زمانے کا آدمی تو

اسے نہیں سمجھ سکتا، بلانوش! تم پروفیسر سے کہہ دو۔ (گاتے ہوئے)
.... لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے!

(ہنستے ہیں)

پروفیسر ٹھاکر: نہیں، میں اخلاق کے متعلق کچھ نہیں کہہ رہا صفدر صاحب۔ میں ...... میں ......

شنکر: اس طرح بیٹھنے کا انداز روسی ہے۔ روسی ہمیشہ کوئی نہ کوئی زاویہ بنا کر بیٹھتے ہیں ان کے چہرے پر ہمیشہ کوئی نہ کوئی کیفیت ہوتی ہے۔ اور آپ کی طرح کورے نہیں دکھائی دیتے۔ اس سے ان کی سوبھاوک آزادی کا پتا چلتا ہے وہ سمٹ کر نہیں بیٹھتے۔ بعض وقت وہ زمین پر لیٹے ہوتے ہیں تو ان کی ٹانگیں کرسی پر ہوتی ہیں۔

پروفیسر ٹھاکر: اسی بات پر مجھے اعتراض ہے شنکر! تم لوگ کچھ بھی ہندوستانی ڈھنگ میں نہیں کرتے۔ تم بیٹھتے ہو تو روسی انداز میں کھاتے ہو تو انگریزی طرز پر اور بولتے ہو تو فرانسیسیوں کی طرح۔ مثلاً اگر تمہیں IT IS A MIRACLE کہنا ہے تو تم منہ کو کچھ اس طرح بگاڑو گے کہ تم کہتے ہوئے معلوم ہو گے CÉSTUNE MIRACLE

امرتا: میرے خیال میں ٹھاکر ٹھیک کہتے ہیں، ہمیں مشرقی آداب کو نہیں بھولنا چاہیے

صفدر: مشرقی آداب کو میں بھی پسند کرتا ہوں مگر دیکھیے، مسند اور پیچوان کی تہذیب کا میں بھی قائل ہوں۔ لیکن آخر اس کیبرے میں آنے کا مطلب؟ کس قدر لطیف چیز ہے شراب سے پہلے ہی سرور کا سامان ہے ؎

میخانۂ یورپ کے دستور نرالے ہیں
لاتے ہیں سرور اول دیتے ہیں شراب آخر

(دبی آواز میں) ہمیں زندگی کی ضرورت ہے!

بلانوش : بیرا ! ایک پیگ اور لاؤ۔ میں اپنے آپ کو مار ڈالنا چاہتا ہوں۔ مجھے موت چاہیے !

بیرا : حضور ! بار اس وقت بند ہو چکا ہے۔

صفدر : بکواس بند کرو پاجی کہیں کے۔ جاؤ نیچے سے ہمارا نام بول دو۔

پروفیسر ٹھاکر : ہم انگریزی ادب کو پسند کرتے ہیں، لیکن ہم کرشن یاترا کو بھول گئے ہیں جنھیں کرشن پجاری اپنے مذہبی تہواروں میں کھیلا کرتے تھے جن میں جیدیو چنڈی داس اور ودیاپتی کے گیتوں کو گایا جاتا تھا، جن میں رادھا اور کرشن روح اور اس کا سوامی مدھر وچنوں میں نہ مرنے والا پریم جتایا کرتے تھے۔ آہ ! جیدیو کا گیت گووند ——— ! کتنا بھاگت نہیں ..... !

شنکر : ہم پرانی روایتوں کے کندھے پر ضرور آئے ہیں لیکن ہم لگڑ بگڑ ، نہیں ہیں جو گڑے مردوں کو اکھاڑتے پھریں۔ تمہارا باپ سلطان تھا تو تمھیں کیا ؟

صفدر : امرت بلانوش (مسکرا کر) ٹھیک ہے ؟ ٹھیک ہے ؟ ٹھیک ہے ؟

پروفیسر ٹھاکر : (میز پر مکا مارتے ہوئے) یہ آپ کے میلی فیسٹو میں لکھا ہے — آپ اپنے ماضی کو نہیں بھلا سکتے۔

شنکر : ہم اپنے ماضی کے وارث ضرور ہیں۔ لیکن ماضی پرست نہیں ہیں اور یہی فرق ہے جسے ہم کمیونسٹ واجب سمجھتے ہیں۔

پروفیسر ٹھاکر : میں صفدر ایسے ادیبوں کی پروا نہیں کرتا جنھوں نے پرانے ادب کو اپنے آپ میں حل نہیں کیا۔ میں امرت، شنکر اور بلانوش جیسے کمیونسٹوں کا قائل نہیں جو کسان کانفرنس میں کوفتے لے جاتے ہیں اور وہاں بھی کوزوں میں کھانا کھاتے ہیں۔

شنکر : اس کا سیدھا سادا مطلب ہے کہ ٹاپ اور پیاز ہماری طبیعت کے موافق

نہیں... آپ ذرا DIALECTICALLY بات کیجیے۔

وفیسر ٹھاکر: (برہم ہوکر) پھانسی پر لٹکانے کے لیے بہترین آدمی ایک کمیونسٹ ہے، سب جانتے ہیں اور سب کے ساتھ وہ بھی جانتا ہے کہ فلاں طریقہ غلط ہے۔ لیکن اس نے سب باتوں کے لیے ایسا جواز پیدا کر رکھا ہے کہ آپ اُسے بحث میں کسی طرح قائل نہیں کر سکتے۔

(شور)

امرت: خوب!..... تو پھر اس بحث کو جانے دیجیے۔

صفدر: ارے بلانوش بے ہوش ہونے والا ہے۔ زندگی کو بلاؤ۔

شنکر، صفدر، امرت: زندگی — زندگی — خاتون زندگی!

(دوسری طرف)

زندگی: لیجیے۔ وہ زندگی کے لیے پکار رہے ہیں اور یہ "موت" آ گئی۔

موت: اُ... ف! میں کتنی تھک گئی ہوں۔ "زندگی!" (ہنستی ہے) مارنا، بگاڑنا، بنانے اور سنوارنے سے کہیں آسان ہوتا ہے۔ لیکن بنانے میں تخلیق کی جو خوشی ہوتی ہے وہ اس کا بدل آپ ہوتی ہے۔ بگاڑنے کی آسانی کس قدر بوجھل ہوتی ہے کہ اس کے بعد تمھیں توڑ ڈالنے کا افسوس ہوتا ہے — کیوں "زندگی"؟ (بار سنوار ہنستے ہوے) آج کے کیمرے نے جسم میں جان نہیں چھوڑی پٹھے بالکل اکڑ گئے ہیں۔

(بلانوش کے رونے کی آواز آتی ہے)

زندگی: منیجر! — وہ طالب علم رونے لگا ہے۔ شاید وہ زیادہ پی گیا ہے (کچھ سوچ کر) کیا اس کے لیے کوئی بھی ذمے داری محسوس نہیں کرتا منیجر؟ — اس نئی پود کے لیے جس کو اس ملک کے بچوں کا باپ بننا ہے اور جس سے اس ملک کی

تمام اُمیدیں وابستہ ہیں۔ کیا انھیں یوں تباہ کر دینے والی زندگی سے کوئی نہیں روکتا؟

موت : اوہ! تم اِن چھوکروں کی قسمت پر آنسو بہا رہی ہو؟۔۔۔ میرے خیال میں یہ سب بالغ ہیں ــــ اپنی رائے دینے کا حق رکھتے ہیں۔ انھیں ہر طرح کی شخصی آزادی ہے انھیں اپنا نفع اور نقصان خود سمجھنا چاہیے۔

مینیجر : میں خاتون 'موت' سے متفق ہوں! (مسکراتا ہے)

زندگی : (کٹ کر) اس لیے کہ یہ چیز آپ دونوں کے لیے مفید ہے لیکن میں کہتی ہوں مینیجر ایسی آزادی نوجوانوں کو ہمارے مغربی ملکوں میں بھی نہیں ملتی۔ انھیں زبردستی کھلی ہوا میں رکھا جاتا ہے۔ اُن کی ورزش، خوراک اور صحت کے لیے حکومت ذمہ دار ہے۔ آخر انھیں لوگوں کو اس ملک کی نسل بڑھانی ہے۔

مینیجر : آپ کیسے کہتی ہیں ان لوگوں کے لیے کوئی پابندی نہیں؟ ان کی نقل و حرکت پر بھی قید ہے مثلاً یونی ورسٹی پراکٹوریل!۔۔۔۔ لیکن اس کے باوجود یہ کسی نہ کسی طرح سینما گھروں، ہوٹلوں اور بازاری اڈوں میں پہنچ جاتے ہیں اور وہاں کی رونق بڑھاتے رہتے ہیں۔

زندگی : تم کیوں نہیں تعلیمی اداروں سے تعاون کرتے؟ کیوں نہیں کالجوں اسکولوں میں اطلاع دے دیتے؟

موت : (قہقہہ لگا کر) "زندگی" بڑی خوش فہم خاتون ہیں۔ اس کام کے لیے ہم لوگوں کو فرصت ہی کہاں ہے؟

مینیجر : ہم اتنے نیک ہو کر اپنے کاروبار کو تباہ کرنا نہیں چاہتے۔ خاتون "زندگی" پھر جیسے 'موت' فرما چکی ہیں ان لڑکوں کو خود اپنا نفع نقصان سوچنا

چاہیے۔

زندگی : مینیجر! تم بڑے ٹھنڈے انسان نظر آتے ہو۔ تم جوانی کی خود سری کو نہیں جانتے۔ معلوم ہوتا ہے تمھاری جوانی کم بخت ماں باپ کی آنکھوں تلے گزری ہے ———

مینیجر : تعجب ہے! آپ نے بالکل درست فرمایا۔

زندگی : خاتونِ موت اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتیں کہ وہ خود نوجوان ہیں۔

موت : خوب! میری کم نظری کے متعلق بھی آپ نے ٹھیک کہا (ہنستی ہے)

زندگی : (موت، زندگی کی سب باتوں پہ ہنس سکتی ہے۔ زندگی جس کے چہرے کی لکیریں غازے نے چھپا رکھی ہیں۔ جس کا پیٹ یوں ہے جیسے کسی خشمگیں بلی نے پنجوں سے زمین پہ لاتعداد نشان بنا دیے ہوں اور جیسے اس نے خوب صورت کپڑوں میں لپیٹ رکھا ہو۔ . . . جوانی کی ہٹ میں میں نے جسم پہ ناپاک حملے کیے جسم جو پاک اور مقدس ہے! . . . تین بار اسقاط کے بعد مجھے پتا چلا جسم ایک ایسی چیز ہے جس کی حفاظت، پرستش کرنی چاہیے۔ یہ ایک ایسی شئے ہے جسے بگاڑنے کا میرا کوئی حق نہیں۔ یہ جسم میرا اپنا نہیں ہے۔ یہ میری اولاد اور اس کے بعد میری اولاد کی اولاد کا ہے۔ یہ ملک اور قوم کی امانت ہے (اداس خاطر ہو کر) . . . . لیکن اس خیانت، اس غداری کے بعد میں تجربے کے بوجھ سے جھک چکی تھی۔

(طالب علم زیادہ شور مچانے لگتے ہیں اور بار بار زندگی کا نام لیتے ہیں)

مینیجر : خاتونِ زندگی! لڑکے آپ کو بلا رہے ہیں آپ ان کا ساتھ دیجیے (کچھ سوچ کر) دیکھیے [illegible] آپ [illegible] اور کم کی پاسش نہ فرمائیے گا آپ وہ کام کیجیے گا [illegible] کیا جاتا ہے۔

زندگی [illegible] اور [illegible] میں [illegible] وہ مجھے بلا رہے ہیں یا صرف

زندہ رہنے کے لیے تڑپ رہے ہیں!

موت : جو کچھ بھی ہو۔ آپ ان کے پاس جائیں تو......

منیجر : ہاں! میں پھر یاد دلاتا ہوں، آپ ان سے وہی بات کیجیے جس کی اشد ضرورت ہے، ورنہ مجھے خاتون 'موت' کو بھیجنا ہوگا۔

موت : لیکن منیجر! آج ہم نے پورٹ شراب کے چار آنے بڑھا دیے ہیں۔ تم فقط رنگدار پانی دے دینا۔ بارہ آنے تم رکھو گے اور آٹھ آنے ہم۔ دیکھیے صاف پانی نہ دکھائی دے۔ اگر خاتون کو ان کے پاس بیٹھنے کا موقع ملا تو آٹھ دس پیگ پلا ہی دیں گے۔

زندگی : (بیزاری سے) لیکن کیا بار بند نہیں ہوا؟

موت : نہیں! بار بند نہیں ہوا۔

منیجر : (خفیف غصّے سے) نہیں محترمہ! ان لوگوں کے لیے بار کھلا ہے۔

زندگی : (طالب علموں کی طرف جاتے ہوئے) میں ان کا ساتھ دینے کو تیار ہوں لیکن جب تک وہ مجھے بلائیں گے نہیں میں ان کے پاس نہیں جاؤں گی۔

(بلانوش سسکیاں لے رہا ہے)

شنکر : ہونہہ! کس قدر بیہودہ انسان ہے بچّوں کی طرح بے تحاشا رو رہا ہے (قدرے اونچی آواز میں) بلانوش! رونا بند کرو۔ ہم تمھاری یہ احمقانہ حرکت برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر رونا نہیں بند کر سکتے تو باہر چلے جاؤ۔

صفدر : شنکر! اتنی سختی مناسب نہیں ہے۔ اگر تم [illegible] کیا ہے تو اس کے رونے کو تم نہیں برداشت کر سکتے [illegible]

شنکر : میں کسی کو [illegible]

پروفیسر ٹھاکر: ایک اور بات، جس سے کمیونسٹوں کو نفرت ہے۔ جذبات! گویا یہ انسانی محسوسات کا حصّہ ہی نہیں ہیں۔

صفدر: وہ ہر طرح سے تمہارا ساتھی ہے۔ تم اپنی مرضی سے زندگی میں اس طرح کا انتخاب نہیں کر سکتے۔ تمھیں کیا حق ہے کہ جس کو چاہو قبول کر لو۔ اور جس کو چاہو رد کر دو۔ تمھیں زندگی کو بحیثیت مجموعی قبول کرنا پڑے گا۔ ہنسنے کے ساتھ رونا، پاکیزگی کے ساتھ غلاظت، زندگی کے ساتھ موت۔ ورنہ زندگی تمھیں رد کر دے گی۔

پروفیسر ٹھاکر: مجھے پینے والوں کی برادری ہی سے نفرت ہے۔ یہ خود پیتے ہیں لیکن پیے ہوئے انسان کو کس قدر نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

شنکر: وہ اس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ سب کام ہوش اور حواس میں کیے جائیں پینے پر کسی کو اعتراض نہیں۔ البتہ پی کر بدر رو میں لڑھکنے والے سے ضرور نفرت ہے۔

امرت: کیوں نفرت کیوں ہے؟ میں نہیں سمجھتا کہ پیتے ہوئے آدمی پیمایش کا خیال رکھے انسان کا اندازہ غلط ہو سکتا ہے۔

صفدر: اس تنفّر کا حق کسی کو نہیں پہنچتا۔ اپنے بھلائیاں لیتے ہوئے بھائی کو رد کرنا سراسر ناجائز ہے۔

پروفیسر ٹھاکر: یہ بالکل SNOBBISH ہے!

بلا نوش: نہیں نہیں، مجھے چھوڑ دو۔ میں تم سب لوگوں کو رد کرتا ہوں۔ وہ جو مجھ سے نفرت کرتے ہیں اُن کو بھی اور جو ہمدردی جتاتے ہیں اُن کو بھی (گلاس اونچا کرتے ہوئے) آہ! شراب کس قدر اچھی چیز ہے۔ جو مجھ ایسے انسان کے احساسات کو تیکھا کر دیتی ہے! اور میں محسوس کرنے لگتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی کو مکمل طور پر تباہ کر لیا ہے دُرک کر میں نے اسی شہر کے ایک کالج سے پہلے ایک ایم اے کیا پھر دوسرا ایم اے اور اپنے چچا کی مدد سے ایک مذہبی یونیورسٹی

میں لیکچرار کی آسامی پر مامور ہو گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پروفیسر ٹھاکر : اوہ بلانوش ! —— تم پروفیسر بھی رہے ہو ؟

بلانوش : (سر اُٹھاتے ہوئے) ہاں ٹھاکر ! میں بھی تمہاری طرح ایک مذہبی یونی ورسٹی میں لڑکوں کو پڑھاتا رہا ہوں ۔ لیکن اس وقت میرے دماغ میں جوانی کا جوش تھا ۔ میں اس وقت باغی خیالات سے بہت متاثر تھا ۔ چنانچہ میں نے لڑکوں کو وہ پڑھایا جسے میں سچ سمجھتا تھا ۔ میں نے کہا ۔ وہ سب کچھ غلط ہے جو اس مذہبی درس گاہ کے لوگ کہتے ہیں ۔ میں نے بغاوت کی اور بے دریغ کی ۔ لڑکوں نے یہ چیزیں کبھی نہیں سنی تھیں ۔ یونی ورسٹی کے ناخداؤں نے ایسے پڑھانے والے کبھی نہیں دیکھے تھے ، اور ان کے اعتراض کرنے پر میں نے نوکری کو لات ماردی ۔

شنکر : اور تمہیں اپنے کیے پر افسوس ہے ؟

بلانوش : نہیں شنکر ! مجھے اس بات کا افسوس نہیں کہ میں نے اس دارالتعلیم کے آستانے پر سر نہیں جھکائے رکھا ۔ البتہ مجھے اس بات کا دکھ ضرور رہے کہ وہ عقیدے جن کی غرض سے میں نے اس ملازمت کو ترک کیا ، انھیں عملی طور پر نبھا نہ سکا ۔ اس کے بعد مجھے نائب تحصیلدار کی آسامی پیش کی گئی ۔ لیکن میں نے اُسے رد کر دیا ۔ (پتھرائی نظروں سے خلا میں دیکھتے ہوئے) ۔ ۔ ۔ آہ ! ایک مقصد کی خاطر ان چیزوں کو رد کرنا میری روح کو کس قدر بلند کیے دیتا تھا ۔

امرتا : (بلانوش کے اور قریب ہو جاتا ہے) پھر کیا ہوا بلانوش ؟

بلانوش : میں نے پارٹی کے لیے کام کیا ۔ لیکن ہمیشہ گرفتاری سے بچ کر ۔ میری ایک ماں ہے ۔ ماں ! جس کی امیدوں کا میں مرکز تھا ۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میں گرفتار ہو کر اسے اس حد تک مایوس کروں کہ وہ ، وہ ، ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن شاید میں نے اسے اپنی بے عملی کا ایک بہانہ بنا لیا تھا ۔ میرے عملی کام کے اچھا ہے کہ وہ مر بھی جاتی تو

میری روح کو بیک وقت دُکھ اور سکون ہوتا، لیکن تم جانتے ہو، ہمارے ملک میں سیاست ایک کھیل ہے جسے صرف امیر لوگ ہی کھیل سکتے ہیں مجھے اپنی کوششیں ایک مچھر کی اُڑان نظر آئیں .....

شنکر : اور تم نے پارٹی میں کام کرنا چھوڑ دیا ؟

بلانوش : میں کبھی کبھی اُن کے اسٹڈی سرکل میں جایا کرتا تھا اور میں نے ارادہ کیا کہ کتابیں لکھنے اور ترجمہ کرنے کا کام شروع کروں۔ لیکن عملی طور پر سیاسی کام اور اس کام میں انتخاب کے متعلق ہمیشہ میرے ذہن میں کشمکش رہی میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو ایک دوراہے پر محسوس کیا۔ پھر اسی دماغی اُلجھن میں میں سب کچھ بھول گیا۔ میں اُن عقیدوں کو بھول گیا۔ اپنے آپ کو بھول گیا میں کوئی کام بھی جی لگا کر نہ کر سکا۔ میں نے گھبرا کر جب انھیں چیزوں کو پکڑنے کی کوشش کی جنھیں میں رد کر چکا تھا تو مجھے پتا چلا کہ وہ میری گرفت سے نکل چکی تھیں ــــ ان چیزوں نے مجھے رَد کر دیا تھا! .... چند مالی مشکلات میں مبتلا ہو کر اب میں ایک کلرک ہو گیا ہوں اور بس! اور جب میرے حاکم بیہودہ باتیں کرتے ہیں تو میں جی میں کہتا ہوں کس قدر لغو ہے، دماغی طور پہ یہ لوگ مفلوج ہیں لیکن ..... وہ اپنی بات منواتے ہیں اور مجھے ان اپاہجوں کے سامنے سر جھکانا ہوتا ہے آہ! وہ شخص جسے اپنے آدرش کا راستہ نہ مل سکے، اس شخص سے کہیں ذلیل زندگی گزارتا ہے جس کا کوئی آدرش ہی نہ ہو۔ (بلانوش پھر رونا شروع کر دیتا ہے۔)

صنوبر : مت روؤ، بلانوش! مت روؤ۔ تمہارا بھی دن آئے گا۔

بلانوش : (روتے ہوئے) اب میں کس قدر فرار ڈھونڈتا ہوں۔ میں اچھے سے اچھے سگرٹ تلاش کرتا ہوں اور انھیں اپنے فرصت کے لمحوں کا ساتھی بناتا ہوں سگریٹ

بھی ایک ٹھوس چیز ہے، میری طرح۔ اور پھر دھوئیں اور راکھ میں تبدیل ہونا شروع ہوتی ہے! پھر میں عورت کی آغوش ڈھونڈتا ہوں، شراب پیتا ہوں۔ ایک بڑی بیماری چھوٹی بیماری کو کچل دیتی ہے۔ لیکن بڑی بیماری ....؟

صفدر: صبر کرو، بلانوش .... اس میں مجھے اپنی دکھ بھری کہانی نظر آتی ہے۔

بلانوش: کرنے کے لیے کوئی بھی کام حقیر نہیں، عمل کے لیے کبھی دیر نہیں — میں اس بات کو جانتا ہوں لیکن کر نہیں سکتا۔ مجھ میں عمل کی قوت نہیں رہی۔ اور اب میری یہ حالت ہے! — (رونے لگتا ہے)

صفدر: مجھے اپنے انجام سے ہمیشہ خوف آتا رہا ہے۔ ایک فنکار سے زیادہ اچھی زندگی کسی کی نہیں۔ وہ عوام پر حکومت کرتا ہے، انھیں احمق کہہ کر ان ہی سے داد وصول کرتا ہے، لیکن فنکار کی زندگی سے زیادہ ذلیل زندگی نہیں۔ جبکہ وہ اپنے عروج سے گزر جاتا ہے جب وہ لوگوں کی نگاہوں کا مرکز نہیں رہتا۔

بلانوش: لیکن تم عمل سے غافل بھی ہوئے؟

صفدر: آہ! تمھیں کیا معلوم بلانوش! اگر میں عامل ہوتا تو میں آج یہاں موجود نہ ہوتا۔ میری صحیح جگہ میرا ڈیسک ہے۔ جب میں نے ادب میں حصہ لینا شروع کیا تو میں سمجھتا تھا میں پیغمبر ہوں۔ کوئی برتر طاقتوں کا پیغام لیے آیا ہوں۔ شروع شروع میں میں ڈاک کے محکمے میں منشی کا کام کیا کرتا تھا۔ ٹکٹیں اور لفافے بیچا کرتا تھا۔ لیکن ٹکٹیں اور لفافے بیچتے ہوئے بھی جب کوئی خیال آتا تو میں اسے لکھ لیتا۔ کئی بار یہ ہوا کہ میں نے ٹکٹیں زیادہ دیدیں اور شام کو خسارا برداشت کیا۔ لیکن میں عامل ضرور تھا۔ اس وقت کام کرتا تھا۔ آدھی رات کو بھی لکھنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا۔

ششنکر: لیکن اب کیا ہوا صفدر؟

صفدر : میں نے وہ حقیر ملازمت چھوڑ دی تاکہ اپنا مقصد حل کر سکوں۔ چند دنوں کے لیے بیوی بچے بھوکے مرے اور میں گھبرا گیا۔ مجھے دن رات محنت کرنی چاہیے تھی۔ لیکن میں نے زندگی میں نے کم سے کم مزاحمت کا راستہ اختیار کر لیا۔ میں بازاروں میں گھومنے لگا۔ ایک مبہم سے احساس کے ساتھ . . . . کہ کچھ ہونے والا ہے! مجھے یقین نہ آتا تھا کہ ہم بھوکوں مریں گے۔ میں گھومتا رہا گھومتا رہا۔ گویا آسمان سے میرے لیے من وسلویٰ اُترے گا۔ جب آسمان سے کچھ نہ اُترا تو میں ایک دوست کے ہاں مہمان ہو گیا۔ اِدھر اُدھر سے چند پیسے بنا کر میں بیوی بچوں کو بھیج دیتا اور خود اس دوست پر بوجھ بنا رہا، وہ میاں بیوی میری خاطرداری کرتے اور شام کو آپس میں جھگڑتے۔ میرا دوست اپنی بیوی کو مارا کرتا اور میں سمجھتا شاید ان کا کوئی نجی تنازعہ ہے۔ لیکن ایک دن خیال آیا کہ مجھے یہاں سے چلا جانا چاہیے۔ میرے دوست کی بیوی نے چرا لو اپنے خاوند کو دے دو وہ زیادہ مرض نخیے، میں چلا گیا اور وہ میاں بیوی ہنسی خوشی رہنے لگے . . . . .

امرت : اور پھر تم گراموفون کمپنی میں کیسے آئے؟

صفدر : اسی طرح کام سے جی چراتا ہوا میں اتفاقاً گراموفون کمپنی کے منیجر کو مل گیا۔ اس نے میری پہلی تنخواہ سے تین گنا زیادہ پیسے پیش کیے میں نے بظاہر بے اعتنائی کا اظہار کیا۔ لیکن میں اپنے دل کی کیفیت جانتا تھا، اس کے ہاں نوکر ہو گیا معاہدہ تھا کہ وہ مجھ سے چھوٹے چھوٹے ڈرامے لکھوائے گا اور انھیں ریکارڈ کرے گا لیکن وہ مجھ سے رائٹ اپ، اور اشتہار کے سوا اور کچھ نہیں لکھواتا۔ وہ میری قیمت نہیں سمجھتا۔ بارہا مجھے وہ شعر یاد آتا ہے ؂

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی تھا

ان چند کلیوں نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ میں اگر مصیبتوں کا مقابلہ کرتا تو میں وہ ادب پیدا کر سکتا تھا جو . . . . .

شنکر: لیکن تم اپنے فرصت کے لمحوں میں کام کیوں نہیں کرتے صفدر ؟

صفدر: وہاں اس قسم کا کام کرنے سے دماغ تھک جاتا ہے شنکر! لیکن نہیں، اُن کلیوں اُن کلیوں نے مجھے آرام کا قابل بنا دیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہر ماہ کی سات تاریخ کو مجھے برابر پیسے مل جائیں گے۔ رات ہوتی ہے تو میں آرام کے لیے لیٹ جاتا ہوں صبح اٹھوں گا اور کچھ کام کروں گا۔ لیکن رات کو میں بستر کا ادب تخلیق کرتا ہوں اور صبح اٹھنے کی سکت نہیں ہوتی۔ چھٹی کے دن کوئی رشتہ دار آجائے تو مجھے ایک آسان سا بہانہ مل جاتا ہے میں خود ہمیشہ بری الذمہ ہوتا ہوں۔ قصوروار دفتر کا منیجر ہوتا ہے، یا میری بیوی اور بچے . . . . یا میرا نکما بھائی جو دس سال سے میرے ٹکڑوں پر پل رہا ہے۔

بلانوش: ایسے ہی ہوتا ہے صفدر۔ ایسے ہی ہوتا ہے۔ . . . .

صفدر: اور میں منیجر سے خوف کھانے لگا ہوں، گویا اس نے میری اس کمزوری کو بھانپ لیا ہے۔ اب وہ بالکل میری پروا نہیں کرتا۔ وہ ہمیشہ اپنے اور ماتحتوں کے درمیان ایک فاصلہ قائم رکھتا ہے۔ وہ کسی کے سامنے نہیں مسکراتا۔ نہ کھانا کھاتا ہے اور نہ کسی خوبصورت لڑکی کی طرف بھوکی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ کس قدر کم گو ہے جب کسی ماتحت سے قصور ہو جائے تو اس وقت اُسے کچھ نہیں کہتا، وہ اپنا کیس تیار کر لیتا ہے اور پھر اپنے شکار کو بے خبری کے عالم میں جھپٹ لیتا ہے۔ ماتحت بے چارہ تلملانے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا . . . . . وہ ڈریفس کے اعزازی وکیل زولا کے انداز میں کہتا ہے! — I ACCUSE . . . اور مجرم اس کیچوے کی طرح تڑپتا ہے جس پر کسی کا پاؤں آجائے اور میں کس قدر ذلیل ہو جاتا

ہوں۔ مجھے یہ بتاتے ہوئے ندامت نہیں محسوس ہوتی کہ پرسوں ایک کاروباری رائٹ اپ اچھا نہ لکھے جانے پر اُس نے مجھے بلایا اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد ایک دم کہا ـــــ "تم احمق ہو" اور مجھے کمرے سے باہر نکال دیا۔ اور یہ وہی دن تھا جس دن مجھے آج کی شراب کے لیے پیسے ادا کرنے تھے !

(میز پر گردن جھکا لیتا ہے)

شنکر: صفدر، صفدر۔ دیکھو واقعی احمق نہ بنو۔ . . . .

صفدر: اگر میں نے ایک فل اسکیپ ورق بھی ہر روز لکھا ہوتا تو مہینے بھر میں ایک کتاب پیش کر سکتا تھا اور منیجر کو چیلنج کر سکتا تھا۔ لیکن میں نے نہیں کیا میں اپنی رذالت میں خوش ہوں۔ میں آرام، صبر اور تشکر کا قایل ہو گیا ہوں اور یہی سب سے بڑی لعنت ہے۔

شنکر: تم نہیں جانتے صفدر! ہم سب ایک ہی تھیلی کے چٹّے بٹّے ہیں۔ میں بھی تم لوگوں کی طرح زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں۔ جیسے ٹھاکر نے کہا ہے ہم شراب اور شباب کا جواز پیدا کرتے ہوئے بھی جانتے ہیں کہ قوم میں جاگرت پیدا کرنے والوں کی جگہ شراب خانہ نہیں ہے . . . . .

پروفیسر ٹھاکر: مدھوشالا نہیں ہے، اچھا ہوا تم بھی سیدھے راہ پر آ گئے۔

شنکر: لیکن سنو! یہ باتیں صرف اس کمیونسٹ سے متعلق ہیں جسے شنکر کہتے ہیں۔ میں ایک بڑے باپ کا بیٹا ہوں۔ پیسہ وافر ہونے کی وجہ سے زندگی کا ہر آرام تعلیم، پیار اور پریم کے حاصل ہونے کے باعث مجھ میں کمتری کا کوئی خیال نہ تھا، میں نے آسانی سے نوجوانوں کی سربراہی اور لیڈری حاصل کر لی۔

امرت: گویا، اب تم لیڈر نہیں ہو!

شنکر: اب میں صرف نام کا لیڈر رہوں لیکن میں عمل سے غافل ہوں میں اب بھی کام کرتا

ہوں۔ لیکن جانتا ہوں میرا دل اس میں نہیں ہے۔ شروع کے دو سال میں نے پسماندہ علاقوں اور گاؤں میں جا کر بہت کام کیا، مجھے وہ دن یاد ہیں جب میری وجہ سے میرے باپ کی نوکری خطرے میں پڑ گئی تھی۔ وہ چپکے سے میرے کمرے میں آئے۔ انھوں نے مجھ سے کچھ نہ کہا۔ وہ صرف دیکھتے رہے۔ ایکا ایکی انھوں نے اپنی پگڑی اتار کر میرے پاؤں میں رکھ دی اور پھر خاموش ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ میں نے نظریں اوپر اٹھائیں۔ میرا باپ بیس سال اور بوڑھا نظر آ رہا تھا۔ ان کی گردن جو زندگی میں کسی کے سامنے نہیں جھکی اس دن میرے سامنے جھکی ہوئی تھی۔ مجھے کوئی حق نہ پہنچتا تھا کہ اپنے عقیدوں کی خاطر اپنے دوسرے بھائی بہنوں کا مستقبل تاریک کر دوں۔ اپنے ماں باپ کا بڑھاپا خراب کر دوں۔ میں نے ان لوگوں سے اپنے آپ کو علاحدہ کر لیا اور خود بھاگ گیا انڈر گراؤنڈ چلا گیا۔ اپنے آپ کو عاق کر لیا۔ گویا میرے ماں باپ مجھے نہیں چاہتے، اپنی دولت چاہتے ہیں۔ میری ماں مر گئی وہ ایک دن میرا نام پکارتی ہوئی گھر کی دہلیز تک آئی، گری، اور پھر نہ اٹھی، میرے عزیز کہتے ہیں، اس کی آنکھیں کھلی تھیں وہ مر چکی تھی۔ لیکن شاید اس کی آنکھیں اور وہ پردہ جس پر نقش مرتسم ہوتے ہیں، زندہ تھا۔۔۔۔۔۔!

مدھر: چپ ہو جاؤ شنکر!۔۔۔ مجھے جلن سا محسوس ہو رہا ہے (قمیص کے بٹن کھول دیتا ہے)

شنکر: میں نے اس غم کو دلیش سیوا میں مدغم کرنے کی کوشش کی۔ میں نے خون پسینہ ایک کر دیا۔ میں کئی بار پکڑا گیا۔ لیکن میرے دل کی شمع روشن رہی۔ میں نے کئی دفعہ جہالت کی چٹان پر سر پھوڑا۔ لیکن میں نے پھر کر ہمت باندھ لی۔ گاؤں کے لوگ سمجھتے ہیں جب سے دنیا بنی ہے ایک راجا ہوتا رہا ہے۔ زمین اس راجا کی ہوتی ہے جس میں ہل چلانے کا معاوضہ وہ لگان، مالیہ کی صورت میں دیتے ہیں درمیان

میں یہ لیگ، کانگریس کہاں سے آٹپکتی ہیں؟ انھیں یقین ہی نہیں آتا کہ یہ زمین اُن کی اپنی ہے۔ وہ ہنس دیتے ہیں ہمارا مذاق اُڑاتے ہیں۔ آخر ایک دن ایسا آیا، میں مایوسی کی کھائی میں گر گیا۔

بلانوش: گویا کوئی خاص واقعہ ہوا؟

شنکر: سنو بلانوش! ایک دن میں نے تین دن سے پیٹ بھر کھانا نہیں کھایا تھا۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ انگارے برس رہے تھے۔ تپش کی وجہ سے کھیت کانپتے نظر آتے تھے۔ پسینے کا ایک قطرہ جو میری گردن سے نکلتا تھا اُسے میں پیٹھ پر سے گھٹنوں پر اور گھٹنوں سے ٹخنوں پر ٹپکتے محسوس کر رہا تھا۔ میری حالت بہت بُری تھی، میں بالغوں کو پڑھا کر اُن میں جاگرت پیدا کر رہا تھا اور وہ اُونگھ رہے تھے، سو رہے تھے، خراٹے لے رہے تھے، میں نے انھیں جھنجھوڑ کر پڑھانا شروع کیا۔ میں نے دیہاتیوں سے سرکار کے متعلق کچھ کہا۔ اچانک اُن کے چہروں کا رنگ بدلا۔ وہ سُرخ ہو گئے۔ سُرخ! میں نے کہا۔ اب ڈھا اور بنا دینے والی رُوسی نفرت پیدا ہوئی لیکن ایک اُٹھ کر بولا، اگر سرکار مجھے کہیں سڑک پر جاتی ہوئی مل جائے تو میں اُسے چوٹی سے پکڑ کر پٹخنی دوں — وہ سمجھتا تھا سرکار کوئی عورت ہے! اور اسی دن میں نے بددل ہو کر گاؤں چھوڑ دیا۔ ناپ اور پیاز کھانے کے بعد میں پھر قورمے اور کوفتے، انھی کورسوں میں کھانے لگا۔ شراب اور شباب کے حق میں بھی میں نے دلیلیں تلاش کر لیں۔ اس قدر نادار تھی! اتنی جہالت!... میں نے کہا۔ ان لوگوں کا کیا ہوا جنھوں نے اپنی زندگی دوبارہ نہ ملنے والی زندگی، ان لوگوں پر قربان کر دی؟ پھر میں نے کہنا شروع کیا، ہمارے ملک میں چھ ماہ اس قدر ذلیل موسم ہوتا ہے۔ اس قدر گرمی پڑتی ہے کہ ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ روس یا روس میں رہتے ہوئے رہی۔ کیا وجود لوگ کہتے ہیں۔

گھوم سکتے ہیں۔ واڈکا اور کیوبس پی کر اپنے آپ کو گرم رکھ سکتے ہیں لیکن یہ ایک بہانہ تھا کام نہ کرنے کا۔ سردی اتنا ہی منجمد کر دیتی ہے جتنا گرمی خون پانی کر دیتی ہے۔ میں نے عمل سے منہ موڑ لیا، اور آج . . . .

صفدر: بس . . . بس شنکر! اس سے زیادہ برداشت نہیں ہوتا۔ ہم سب کو درحقیقت عامل ہونے کی ضرورت ہے۔ ہمیں زندگی سے ٹکر لینی چاہیے۔

بلانوش: ہمیں اپنے ماحول سے جنگ کرنی چاہیے۔

پروفیسر ٹھاکر: ہمیں بھارت کی پرانی روایتوں کو زندہ کرنا چاہیے۔ ہمیں پُران، وید پڑھنے چاہییں وہی ہمیں عمل کی راہ بتا سکتے ہیں۔ اس بدبختی روش نے ہمیں کہیں کا نہیں رکھا۔

امرتا: ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ حرکت میں برکت ہے صفدر! تم اپنے آنسو پونچھ ڈالو۔

بلانوش: (استغراق سے اٹھتے ہوئے) صفدر آرٹسٹ ہے! وہ سب کے لیے کڑھتا ہے، روتا ہے اسے رو لینے دو۔ اسے ہمارے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے دو۔ اس کے یہ آنسو مبارک ہیں۔ شاید ان کے بعد ہم عملی انسان بن جائیں!

صفدر: آہ بلانوش! ایسے آنسو ہم اس سے پہلے بھی بہا چکے ہیں۔

شنکر: خاموش صفدر! صبر! ہم ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں لیکن تم ایا بیان ہو۔ GENRE! زمانے کی روح! تم ایک آئینہ ہو جس میں ہمارا سماج اپنا منہ دیکھ سکتا ہے۔ جانے دو، جانے بھی دو، دوست! اگرچہ ہم نے ایسے آنسو کئی بار بہائے ہیں۔ لیکن ان آنسوؤں کے بعد ہم ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے!

امرتا: آج ۔ ۔ ۔ ہم ایک نیا راستہ اختیار کریں گے۔

پروفیسر ٹھاکر : آج سے، ورتمان سے ہم کچھ بھی نہیں لے سکتے۔ بہائے ہوئے آنسوؤں کا کرودھ سا تھ نہ ہوگا تو یہ آنسو بھی اکارتھ جائیں گے۔
بلا نوش : آج ہم نئی کروٹ لیں گے ہمارے اُفق پر ایک نیا ستارہ نمودار ہوگا۔ وہ زندگی آ رہی ہے۔ (وقفہ۔ سب ایک انہماک کے ساتھ اُدھر دیکھنے لگتے ہیں۔)
پروفیسر ٹھاکر : وہ ایک لجائی ہوئی سندری کی طرح پیچھے دیکھ رہی ہے۔
شنکر : (گھبرا کر) ارے! اس نے آگے نہ دیکھا تو وہ گر پڑے گی۔ اس کی راہ میں بیسیوں رکاوٹیں ہیں۔ تختے، میوزک اسٹینڈ، خوبصورت مرد!.....
صفدر : ہاں شنکر! وہ گر پڑے گی۔ اگر روشنی پیچھے کی طرف سے آئے تو سایہ ہمارے آگے پڑتا ہے۔ اور روشنی جتنی پیچھے ہو سایہ اتنا ہی لمبا ہوتا ہے.....
بلا نوش : روشنی سر پر ہونی چاہیے۔
شنکر : اپنے پاؤں کا سایہ نہیں دکھائی دے گا۔ روشنی آگے ہونی چاہیے۔
پروفیسر ٹھاکر : میں سمجھتا ہوں تمھارا کیا مطلب ہے، لیکن میں کہتا ہوں روشنی آگے ہو تو پیچھے اپنا ہی سایہ بھوت بن کر ڈرانے لگتا ہے۔
صفدر : "زندگی" ہم تک آتے ہوئے گھبرا رہی ہے اپنا بدن چُرا رہی ہے؟
پروفیسر ٹھاکر : جیسے اپنے ہونے کی چھپا چاہتی ہے۔
بلا نوش : لیکن اس کا زرق برق لباس!....
صفدر : وہ اپنے آپ کو چھپا نہیں سکتی اگرچہ اس میں اتنی تیزی اور طراری نہیں جو کیبرے ناچ کے وقت تھی۔ شاید اس لیے کہ اس وقت وہ زندگی کی فنکارانہ شکل تھی اور اب..... (زندگی قریب آجاتی ہے وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا لبادہ تھامے ہوئے ہے)
زندگی : کیا میں آپ لوگوں کے پاس بیٹھ سکتی ہوں؟

بلانوش : (اُٹھ کر، جھکتے ہوئے) وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے!

صفدر : ہم زندگی کے ہی منتظر تھے۔ ہمارے اعصاب بالکل مُردہ ہو چکے تھے (اپنی کرسی خالی کر دیتا ہے) آئیے، آپ میرے قریب بیٹھیے۔

امرت : آپ کچھ کھوئی کھوئی معلوم ہوتی ہیں۔۔۔۔

زندگی : (گھبرا کر) نہیں میں کھوئی ہوئی نہیں۔ لیکن یہ جگہ جہاں آپ بیٹھے ہیں مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔ میں اس سرد منجمد کمرے میں نہیں آنا چاہتی تھی لیکن میرے خدا نے زبردستی مجھے اِدھر دھکیل دیا ہے، اُسے یہ کھیل بیحد مرغوب ہے!

صفدر : ہاں، یہ کمرہ اسی قسم کا ہے۔ لیکن (وقفہ) وہ کیبرے ناچ کس قدر خوبصورت تھا۔ زندگی کے آتے ہی تاریکی دُور ہو گئی تھی۔ سارا ہال جگمگا اُٹھا جیسے اس دُنیا میں ہو کا عالم ہو گا۔ زندگی آئی، اُس نے حرکت کی، تو ساری دُنیا منور ہو گئی نغمے گونج اُٹھے۔ نور و نغمے سے ہی دُنیا کی بنیاد ہے۔

بلانوش : زندگی کا بار بار پہلو بچانا، اور موت کے چنگل میں نہ آنا، خوب تھا۔

پروفیسر ٹھاکر : اُس ستون کے پاس جب زندگی جھکی تو میں نے سمجھا موت نے آ ہی لیا ہے لیکن کس طرح ایک جست کے ساتھ زندگی موت کے بند ہوتے ہوئے بازوؤں سے نکل گئی۔۔۔۔۔

زندگی : ہاں۔ لیکن اس ڈرامے کا انجام آپ لوگ بھول گئے ہیں۔ آپ آنکھیں جھپک رہے ہیں، جیسے ابھی تک یقین نہیں آتا کہ آخر موت نے زندگی کو دبا لیا تھا۔ (زہر خند سے) — کتنا دلچسپ دھوکا ہے کہ آپ اسے محض ایک کیبرے ناچ محض ایک کھیل سمجھ رہے ہیں۔

شنکر : اگر اس کے بعد "زندگی" ہماری رفیق نہ ہوتی تو شاید ہم اسے ایک

کھیل سے زیادہ سمجھتے۔ لیکن ہر روز سینکڑوں انسان مرتے ہیں اور
اُن کی جگہ نئے پیدا ہوتے ہیں ـــــ اور زندہ لوگوں کے رفیق ہوجاتے ہیں!

صفدر: اور پھر کوئی دھن، کوئی لگن ـــــ ع
ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شُد بعشق

بلانوش: آپ کیا پییں گی؟

زندگی: نہیں۔ میں سب کچھ پی چکی ہوں، . . . . میں اب کچھ نہیں پینا چاہتی۔
اور پھر بار بند ہو چکا ہے۔

بلانوش: بار ہمارے لیے کھلا ہے۔ چوبیس گھنٹے کھُلا ہے (آواز دیتے ہوئے)
بیرا!

زندگی: نہیں، میں کہتی ہوں، مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ اس بادہ خوری
کی مشق اتنی بڑھ چکی ہے کہ پی کر نشہ اُتر جاتا ہے . . . .

شنکر: آپ جانتی ہیں ہم ہندستانی بڑے مہمان نواز ہیں۔ اتنی مدت سے ہم نے
آپ کی میزبانی کا فخر حاصل کر رکھا ہے تو آج . . . . . .

بلانوش: ایک ایک پیگ ہو جائے خاتون "زندگی" کی صحت کا جام! اے بیرا!

بیرا: حضور!

صفدر: کدھر مر گئے تھے اُلّو؟

بلانوش: پانچ وِسکی ـــــ اور ایک پورٹ!

زندگی: ہندستانی بڑے مہمان نواز ہیں۔ لیکن اتنی بھی میزبانی سے تو مہمان بھی
اکتا جاتا ہے۔ اچھا بات یہ اور میں امریکن ہوں!

شنکر: عجیب! آپ امریکن ہیں! ـــــ اور خاتون ہوسٹس؟

زندگی: اس کھیل کا چوتھا اور تنہا لفظ "دوست"! ہم دونوں بڑا الفت ہیں۔

صفدر: آج آپ پہلے کی طرح خوش نظر نہیں آ رہی ہیں۔ گویا ابھی آپ کی کسی کے ساتھ جھڑپ ہوئی ہے۔ مینیجر سے تو آپ کے تعلقات خوشگوار ہیں نا؟

پروفیسر ٹھاکر: بات یہ ہے — آج شاید لڑکوں نے زیادہ دھیان نہیں دیا۔

زندگی: بلکہ یوں کہیے کہ ضرورت سے زیادہ توجہ فرمائی ہے۔ زندگی کے بیٹے کون واویلا کر رہا تھا؟

امرت: (کھسیانہ ہو کر) ہم ہی لوگ تھے۔ بات یہ ہے محترمہ! ہمارے ملک میں جنسی بھوک بہت زیادہ ہے!

زندگی: (روکھی سی ہنسی کے ساتھ) جنسی بھوک! ...... جنسی بھوک! میں جہاں سنتی ہوں جنسی بھوک کے ہی قصے سنتی ہوں۔ یہی داستان پڑھتی ہوں!! یہ بیسویں صدی کے سب سے زیادہ دُہرائے گئے الفاظ ہیں...

شنکر: ان کے دُہرانے میں کیا حرج ہے؟ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ملک میں عورتیں مردوں کی نسبت کم ہیں اور پھر یہاں کے رسم و رواج ان کے میل جول کے خلاف ہیں۔

زندگی: کیا ان الفاظ کا اس بہتات سے استعمال ہونا دلیل نہیں ہے کہ اسے اسی وقت ترک کر دیا جائے۔ اگر آپ اسے استعمال کیے بغیر نہیں رہ سکتے تو خدارا اس کے لیے کوئی اور ہم معنی الفاظ تلاش کر لیجیے! اس کے استعمال سے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی پتھر پر لوہا رگڑ رہا ہے!

پروفیسر ٹھاکر: آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں!

امرت: مجھے خاتون زندگی سے اتفاق نہیں ہے۔ ہم کیا نئے کا لفظ ڈھونڈ لیتے ہیں

مرتبہ استعمال کرتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس لفظ کو چھوڑ دیا جائے۔

زندگی : غلط ہے۔ ہم اس وقت نہیں تو اس کے کچھ دیر بعد کچھ نہ کچھ کھا لیتے ہیں اور اس کی رٹ نہیں لگاتے اور آپ کا کیا خیال ہے۔ امریکہ اور برطانیہ اور دوسرے مغربی ملکوں کے مرد، عورت کے معاملے میں کم بھوکے واقع ہوئے ہیں؟ وہ بھی ایسے ہی بھوکوں کی طرح عورت کا پیچھا کرتے ہیں۔ وہاں بھی عورت کو آزادی نہیں۔ وہاں بھی اس پر ایسے ہی جبر کیا جاتا ہے.....

شنکر : معاف کیجیے، ہم آپ کا مطلب نہیں پا سکے۔

زندگی : مطلب ظاہر ہے۔ دراصل آپ کی جنس کا مقام سر ہے اور وہ جگہ نہیں جہاں اسے ہونا چاہیے۔

(سب اچھل پڑتے ہیں)

بلا نوش : خاتون 'زندگی' کی بات قابلِ غور ہے۔

صفدر : آپ درست فرماتی ہیں۔ اللہ قسم! ایک افسانے کا موضوع ہے۔

شنکر : خاموش! بات سننے دو۔ ساری دنیا سمٹ کر ایک افسانے تک محدود ہو گئی ہے۔ کتنا ذلیل رویہ ہے۔ ہر ایک چیز سے افسانہ ڈھونڈنے کی کوشش کرنا اور زندگی، ہزار رنگ زندگی سے لطف نہ اٹھانا۔

صفدر : گویا خاتون کی چوٹ کا بدلہ مجھ سے لیا جا رہا ہے۔ میں اس پر بحث کر سکتا ہوں۔

پروفیسر ٹھاکر : شنکر کے ساتھ بحث کر سکتے ہو؟

زندگی : تم سب کتابی باتیں کرتے ہو۔ سب بیکار ہو۔ ہوٹلوں میں بیٹھ کر

شراب اور کافی پیتے ہو، اور جنس کے متعلق باتیں کرتے ہو۔ تم بالکل بے عمل ہو۔ بالکل بے عمل۔ بیدار ملکوں میں ہوش سنبھالتے ہی ایک نوجوان کو آٹھ دس گھنٹے کے لیے ایک ورکشاپ میں ڈھکیل دیا جاتا ہے۔ وہاں وہ تیس بتیس نوڑے گوبیوں کے بناتا ہے۔ مشینوں کے بیے درجنوں ایکسل تیار کرتا ہے اور بوائلر کی حرارت میں کھڑا پگھلتا رہتا ہے جب وہ باہر آتا ہے تو اُسے صرف ایک ہی بھوک ہوتی ہے۔ پیٹ کی بھوک! دنیا میں اور پھر ہندستان میں، ایک ہی بھوک مقدّم ہے۔ اور وہ ہے پیٹ کی بھوک۔ دوسری بھوک، پیٹ کی بھوک کے بعد بیکار آدمی کا مشغلہ ہے!

شنکر: ہمیں "زندگی" کی سب باتوں سے اتفاق نہیں ہے، لیکن . . . . .

صفدر: لیکن ہم ان کی باتوں سے عمل کا سبق ضرور حاصل کر سکتے ہیں۔

زندگی: تم ابھی بالکل نوعمر ہو! شراب نے جیسے میرے پھیپھڑوں کو چھلنی کر دیا ہے ایسے ہی تمھارے دل اور دماغ بھی ناکارہ بنا دے گی! تمھاری کمزور اولادیں تمھارے سامنے آکر تمھاری ہی مصیبت کا باعث ہوں گی۔ جاؤ، کام کرو، کرنے کے لیے کوئی بھی کام حقیر نہیں ہے۔

GO TO THE ANTS—SLUGGARDDS

بلا نوش: (اُٹھ کر) میں قسم کھاتا ہوں، آج یہ شراب کا جام میرا آخری جام ہوگا۔ "زندگی" کی صحت کا جام!

شنکر: زندگی کی صحت کا جام اب آخری جام!

اصرت: اس شراب کے آخری گھونٹ کو حلق میں اتار لو۔ اور اس بیہودہ نفس کو ختم کر دو۔

صفدر: مجھ میں روح عمل حلول کر گئی ہے۔ اس آخری گھونٹ کے بعد میں ایک عملی زندگی بسر کروں گا۔

شنکر: اور یہ آخری لڑکی ہوگی، جس کے ساتھ میں ناچوں گا: "زندگی"۔

امرت: یہ آخری ریستوران ہوگا اور آخری کیبرے۔ اس کے بعد ہم عوام میں کام کریں گے۔ ہمارا سایہ کبھی کسی گندی پبلک جگہ میں دکھائی نہیں دے گا۔

پروفیسر: یہ میرا آخری قہقہہ ہوگا!

صفدر: (غصے میں، پروفیسر! ہم مذاق نہیں کر رہے ہیں۔ آج ہمارے لیے صُور پھونکا گیا ہے۔ شاید تمھیں اس کی آواز نہیں آ رہی۔ آج ہم سب اپنی اپنی قبروں سے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ آج یہ ہماری آخری نیند ہوگی!

(شور ــــ جس میں لفظ 'آخر' علاحدہ سُنائی دیتا ہے)

مینیجر: آرڈر، آرڈر ــــ (قریب آتے ہوئے) جنٹلمین میں کہتا ہوں آپ لوگ....
(باقی کی آواز شور میں گم ہو جاتی ہے)

مینیجر: (غصے میں، خاتون زندگی، رنگ میں چلی آئیے۔ آرکسٹرا انتظار کر رہا ہے۔ (طالب علموں سے) اور آپ لوگ یہاں شور نہیں مچا سکتے ہیں۔

بلانوشں: ہم شور مچائیں گے، شور ہمارا پیدائشی حق ہے۔ شور زندگی کا ثبوت ہے۔

مینیجر: میں کہتا ہوں۔ اگر اس سے زیادہ شور مچایا تو میں نقصِ امن کا اندیشہ کر دان کر پولیس کو اطلاع دے دوں گا۔

امرت: پولیس کے لوگ ہمارے اپنے بھائی ہیں۔ وہ ہم پر ہاتھ نہیں اٹھائیں گے

مینیجر: آپ اپنے بھائیوں کو نہیں جانتے ہیں۔ وہ قانون اور امن کے محافظ ہیں وہ

ہز میجسٹی کی گورنمنٹ کے وفادار ملازم ہیں۔

پروفیسر ٹھاکر : آپ ناراض نہ ہوجیے، منیجر صاحب! خاتون ' زندگی '، شنکر کے ساتھ رِنگ میں جا رہی ہیں . . . . .

زندگی : میرے ساتھ آپ نے میری روح کو نہیں خرید لیا، منیجر! مجھے رِنگ میں جانے سے انکار کی پوری آزادی ہے۔

منیجر : معاف کیجیے۔ آپ کو معاہدے کی رُو سے رِنگ میں جانا ہوگا ۔ JAAZ موسیقی کے بعد آپ ان لوگوں کے پاس نہیں ٹھہر سکتی ہیں۔

زندگی : اگر میں یہاں سے چلی جاؤں گی تو اس کیفے سے بھی چلی جاؤں گی۔

شنکر : منیجر! کیا آپ نے خاتون 'زندگی' کو PERSONA NON-GRATA قرار دیا ہے؟

صفدر : ہاہاہا !!!

منیجر : (غصّے سے) میرے نزدیک یہ کیفے ایسی نسوانی خواتین سے زیادہ قیمتی ہے۔ اگر آپ کو صرف خاتون کی ضرورت ہے تو میں ' زندگی ' کی رفیق کار کو بھیج سکتا ہوں۔

شنکر : خاتون ' زندگی '! چلیے چلیے، ہم آج یہ آخری ناچ آپ کے ساتھ ناچیں گے۔

زندگی : میں رِنگ میں چلی جاتی ہوں۔ لیکن اس کیفے میں میرا یہ آخری دن ہوگا۔ میں ایسی بے حرمتی برداشت نہیں کر سکتی چلیے!

(چلے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ناچ دھن، چہ میگوئیاں، ہلکے ہلکے قہقہے، اور گلاسوں کے ٹکرانے کی آوازیں آتی ہیں)

بلانوش : موت، آ رہی ہے۔

صفدر : خاتون ' زندگی ' کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے۔ کیا وہ کچھ بوڑھی دکھائی نہیں دیتی؟

امرت: معلوم ہوتا ہے اس نے اپنے چہرے کی لکیروں کو کریم کے مساج سے درست کر رکھا ہے۔

بلانوش: وہ عمر رسیدہ عورت ہے اور تجربہ کار۔ جب خون جلد کے کناروں تک نہ آئے تو غازہ بھی پھٹ جاتا ہے..... اور منہ پر چھائیاں دکھائی دینے لگتی ہیں۔

پروفیسر ٹھاکر: زندگی، نے دنیا دیکھی ہے۔

بلانوش: ہاں، اس نے زمانے کا سرد و گرم چکھا ہے۔

پروفیسر ٹھاکر: لیکن وہ ایک ہمدرد عورت ہے۔ وہ ہمارے کلچر کو یوں تباہ ہوتے دیکھ کر دکھی ہوتی ہے۔

بلانوش: کسی زمانے میں وہ خوبصورت رہی ہوگی۔ لیکن اب....

امرت: اب تو اس کی شکل سے گھن آتی ہے۔

صفدر: وہ بہت پکے ہوئے پھل کی طرح ہے۔ آپ جانتے ہیں کوئی چیز بہت میٹھی ہو جائے تو آپ اس کا ایک لقمہ بھی نہیں کھا سکتے۔

بلانوش: خاتون 'موت' ابھی کمسن دکھائی دیتی ہے۔

امرت: شگفتہ اور خوبصورت! لیکن وہ "موت" ہے۔

پروفیسر ٹھاکر: اس نے اپنا ہُڈ اور اپنے ناخن اُتار دیے ہیں۔ کالے لباس میں اس کا سفید چہرہ خوب صورت معلوم ہوتا ہے۔

صفدر: 'موت' بذاتِ خود کوئی خوف پیدا کرنے والی چیز نہیں۔ البتہ اس کا خیال گھناؤنا ہوتا ہے۔ فلسفیوں کا خیال ہے کہ موت کا خیال موت ہے موت بذاتِ خود زندگی ہے۔

پروفیسر ٹھاکر: شاستروں میں لکھا ہے 'مرتیو' ایسا دروازہ ہے جس سے گذر کر ہم نو جیون پاتے ہیں۔

(خاتون 'موت' اپنا ذکر سن کر متوجہ ہوتی ہے اور منیجر کا اشارہ پا لینے کے بعد

ان لوگوں کی طرف چلی آتی ہے)

موت : کیا میں اِدھر آسکتی ہوں ؟

امرتا : (کچھ رک رک کر) ..... آیئے ..... خاتون موت ..... !

بلانوش : (اُٹھ کر تشریف رکھیے ۔ (اپنی جگہ خالی کردیتا ہے)

صفدر : ہا ہا ! ! موت نے کبھی آنے کی اجازت طلب کی ہے ؟

موت : معلوم ہوتا ہے آپ زمانے کے ساتھ نہیں دوڑ رہے ہیں ۔ بیسویں صدی کے سائنسدانوں نے دنیا کی کایا پلٹ دی ہے ۔ موت کو اجازت لینا سیکھنا چاہیے کیوں کہ اور چند سالوں تک وہ اُن لوگوں کی اجازت کے بغیر نہیں آسکے گی ۔ جیسے ..... جیسے اب زندگی اجازت لے کر آتی ہے !

بلانوش : ہو ہو ہو ! ! !

امرتا : THAT'S BRILLIANT

پروفیسر ٹھاکر : CLEVER TOO!

موت : آج زندگی ہستی کے دروازے پر کھڑی کانپتی ہے ، محبت ، جوش اور غصّے کے ساتھ ! لیکن ہستی چند جھلیاں اُس کے سامنے تان دیتی ہے اور اس کے وجود میں آنے کی خواہش کو پورا نہیں ہونے دیتی اور موت "

بلانوش : خاتون "موت" "زندگی" سے زیادہ عقلمند ہیں ..... ان کی باتوں میں سادگی کی نسبت عیّاری اور پُرکاری زیادہ ہے ! (موت کا ہاتھ تھام لیتا ہے) آپ کے ہاتھ کس قدر نرم ہیں محترمہ !

صفدر : شیریں کا عشق فرہاد کا ہنر ہے ۔ شاید تم ان ہاتھوں کے گداز کا اندازہ نہیں لگا سکتے !

امرتا : سانپ کس قدر تُندرست ہوتا ہے ، لیکن اُس کے سر میں زہر ہے ۔

پروفیسر ٹھاکر : سوندریہ شاستر کے وِدّیارتھی اس زہر کی پروا نہیں کرتے۔
بلانوش : شراب کا جام وہ ہے جو تمھیں اس دُنیا کے رنج اور غم سے آزاد کر دے۔ ایک اور جام کے بغیر مجھے محسوس ہوتا ہے۔
بہار بے سپر جام و یار گزری ہے

(سب داد دیتے ہیں)

مونتا : میں آپ کے لیے وہسکی، اور اپنے لیے ایک پورٹ منگوا سکتی ہوں؟
امرتا : لیکن . . . . ..

(سب پر افسردگی چھا جاتی ہے)

پروفیسر ٹھاکر : ہم سوگند لے چکے ہیں۔
صفدر : (رُک کر) . . . . خاتون . . . . ہمیں افسوس ہے۔ ہم آج قسم کھا چکے ہیں کہ شراب کا یہ جام ہمارا آخری جام ہوگا۔ اسے ہم پی چکے ہیں۔
بلانوش : آپ اپنے لیے پورٹ منگوا سکتی ہیں۔
مونتا : ایک اور جام کے بغیر آپ لوگوں کی رگیں مردہ ہو رہی ہیں۔ ان ہاتھوں سے دیے ہوئے جام سے کبھی کسی نے انکار نہیں کیا۔
بلانوش : لیکن . . . . . مادام! . . . (شنکر کی طرف دیکھتا ہے) شنکر، زندگی کے ساتھ ناچ رہا ہے . . . . اور ہم . . . .
صفدر : وہ اچھا ناچتا ہے — میرا خیال تھا اُس کا پاؤں زندگی کے پاؤں پر پڑ جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا . . . اور ہمارا عہد تھا کہ زندگی، آخری لڑکی ہوگی!
امرتا : یہ آخری کھیل ہوگا اور آخری کھیل سے —
مونتا : شاید یہ تمھاری آخری مہک ہوگی!
بلانوش : میں کچھ کہنا چاہتا ہوں . . . (ٹہلا میں گنگناتے ہوئے) میں کیا کہتا

چاہتا ہوں۔

صفدر: میں نہیں جانتا، میں کچھ نہیں جانتا.....

بلانوش: (اٹھ کر۔ اور جوش سے) ہم اور شراب منگوا سکتے ہیں۔ ہم خاتون 'موت' کی رفاقت میں ناچ سکتے ہیں۔ ہمیں اپنی قسم توڑنے کی نوبت نہیں آئے گی۔

صفدر: (خوش ہو کر) وہ کیسے بلانوش؟

بلانوش: ہم نے کہا تھا، آج سے ہم ان سب چیزوں کو چھوڑ دیں گے۔ آج سے! جس وقت ہم نے یہ قسم لی تھی۔ اس وقت گھڑی بارہ بجا چکی تھی۔ بارہ بجے کے بعد دوسرا دن شروع ہوتا ہے۔ اس لیے ہمارا آج کا دن ختم ہونے میں ابھی تیئیس گھنٹے باقی ہیں۔ اے بیرا! پانچ وسکی اور ایک پورٹ لاؤ۔

صفدر: خوب، گویا ابھی پورا ایک دن باقی ہے۔

امرت: (مسرت کے عالم میں) خاتون..... ادھر بیٹھ جائیے۔

صفدر: شنکر کو بلالو، "زندگی" کو آواز دو!

بلانوش: ہمیں 'موت' چاہیے، 'زندگی' بہت بوڑھی ہے۔ اے بیرا! پانچ وسکی اور ایک پورٹ۔ کدھر مر گئے تھے، گدھے؟.....

(سب مل کر ہنستے ہیں 'موت' کی خوفناک ہنسی سب سے زیادہ بلند ہے ———)

(پردہ)

رخشندہ

(کردار، جس ترتیب سے وہ کھیل میں وارد ہوتے ہیں)

رخشندہ : بائیس ۲۲ تیئیس ۲۳ برس کی ایک پڑھی لکھی، اعصاب زدہ لڑکی۔
آپا : رخشندہ کی آپا
دولھا بھائی : رخشندہ کے دولھا بھائی
بھابی : رخشندہ کی بھابی
بھائی جان : رخشندہ کے بھائی جان
ننھے میاں : رخشندہ کا چھوٹا بھائی
امّاں جان : رخشندہ کی امّاں جان
آپ : رخشندہ کے جسم اور رُوح کے مالک

پہلا منظر

ایک پرانی وضع کے ٹھاٹ دار مکان کا بیرونی حصہ
ایک گیلری سی اس مکان کے اردگرد دوڑ گئی ہے جس کا ایک حصہ سامنے نظر آ رہا ہے۔ اس گیلری پر ٹین کی ایک چھت ہے جو چوڑائی میں گیلری جتنی ہے۔ چھت بارش کو روکنے کے لیے کافی ہے بشرطیکہ بارش تیز ترچھی نہ ہو۔

اس وقت سخت بارش ہو رہی ہے اور بجلی کڑک رہی ہے۔ چونکہ ہوا زوروں پر ہے، اس لیے گیلری پر سے گزرنے والا بھیگ جاتا ہے۔ پردہ اٹھنے کے تھوڑی دیر بعد رخشندہ، دیوار کے ساتھ لگی ہوئی سامنے نظر آنے والے دروازے کی طرف بڑھتی ہے .... اگر وہ کھڑکی اور دروازے کے درمیان شمعدان نما بڑھاؤ کو پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھاتی ہے تو اس کی شلوار کے پائنچے چھوٹ جاتے ہیں اور اگر وہ پائنچے پکڑتی ہے تو شمعدان ہاتھ میں نہیں آتا اور وہ دیوار کے ساتھ ساتھ نہیں جا سکتی۔

رخشندہ — تھوڑے رکھ رکھاؤ کے بعد مزاحمت نہیں کرتی اور اپنے آپ کو بھیگنے دیتی ہے۔ ساٹن کی شلوار، اور آرگنڈی کی قمیص اس کے ڈیلے پتلے اور روح ایسے لطیف جسم کے ساتھ چپک جاتی ہے۔ رخشندہ کے بال بکھرے ہوئے ہیں۔ بجلی چمکتی ہے تو اس کے سفید چہرے پر سر کے بھورے بال یوں معلوم ہوتے ہیں جیسے دیے کی لو سے کرنیں پھوٹ رہی ہیں

— وہ رخشندہ ہے!

دروازے کے پاس پہنچ کر رخشندہ آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹاتی ہے لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں ملتا۔ ڈرتے ڈرتے وہ پھر دروازے پر ہاتھ مارتی ہے ــــ

رخشندہ: آپا! آپا . . . . . (التجا سے) آپی! کھول دو نا کواڑ۔ دیکھو واسطہ دیتی ہوں بڑوں کا۔

آپا جان: (اندر سے) کون؟ رخشندہ ہے باہر؟ (دروازہ کھولتے ہوئے) رخشی! سٹرن کہیں کی اتنی رات گئے کدھر آدھمکیں تم ــــ؟

رخشندہ: تم کہو گی وہی پرانی عادت . . . . آپا! لیکن دیکھو، کس قدر اندھیری رات ہے بجلی کڑک رہی ہے۔ حوصلے کے پر جلے جاتے ہیں اور "آپ" ابھی تک نہیں آئے اس وقت بارہ یا ایک بجا ہوگا۔ اللہ جانے کدھر بیٹھ رہے ہیں؟

(پھر رعد کی گرج اور بارش کی آواز سنائی دیتی ہے)

آپا جان: ظاہر ہے، کلب سے واپسی پر بارش نے آیا ہوگا۔ اُف کتنی بارش ہے، سامنے مکان کی سلیٹ والی چھت پر اولوں کی آواز . . . کتنی بھیانک معلوم ہوتی ہے (سوچ کر) . . . لیکن کیا عجب ہے جو سلامت بھائی اسکول کے برآمدے میں چھینٹے سے بچنے کے لیے ٹھیر گئے ہوں، کیا پہن رکھا تھا انھوں نے؟

رخشندہ: وہی ان کی دل پسند کالی پتلون تھی اور ریشمی شرٹ۔ جانے سے پہلے بہت دیر تک آئینہ کے سامنے کھڑے بال بناتے رہے۔ میں کہتی ہوں آئینہ بھی تنگ آ گیا ہوگا۔ ان سے!

آپا جان: ہاں تو سلامت کیا مجھ سے چھپے ہوئے ہیں۔ ان سے یہ امید نہ رکھو کہ کپڑوں کی پروا نہ کرتے ہوئے گھر چلے آئیں گے۔

رخشندہ : (بجلی کی کڑک سُن کر) آپا! میں یہ سب باتیں تمھیں یہاں کھڑا رکھنے کی غرض سے کہہ رہی ہوں، اس بجلی کی خوفناک آواز سے میرا قلب ؟ لٹا جاتا ہے اور آپا! دولہا بھائی نے یہ کیا نحوست پھیلا رکھی ہے جو چھ گھنٹے سے سو رہے ہیں ؟

آپاجان : سو کب رہے ہیں ؟ آپ سوتے ہیں نہ مجھے سونے دیتے ہیں، ان کی طبیعت تمھیں پتا ہے نا۔ دماغ میں خیال پیدا ہو گیا کہ شطرنج کھیلیں گے۔ اب اور اسی وقت میں ہی ذری آنکھ جھپکنے لگی تھی کہ موئے شطرنج میں گھسیٹ لیا مجھے۔

رخشندہ : آپا! تم قیاس کر سکتی ہو، وہ کیوں نہیں آئے ؟ یہ ہاتھ میرے کلیجے پر رکھ کر دیکھو، کس طرح کی دھمک پیدا ہو رہی ہے!

آپاجان : رخشی! تم ناحق گھبرا رہی ہو، ناحق۔ ابھی آئیں گے سلامت بھائی تو بڑی ہنسی ہو گی، پھر آنکھیں چار نہ کی جائیں گی تم سے۔

رخشندہ : آپاجان! واپس جانے کی کوشش کیوں کر رہی ہو ؟ کیا تمھیں اپنی خوف زدہ بہن کا ذرا بھی خیال نہیں میری مصیبت کا ذرا بھی اندازہ نہیں ؟ تمھیں ادھر مشغول رکھنے کے لیے دولہا بھائی سے اجازت طلب کر لیتی ہوں، تم گھڑی دو گھڑی میرے پاس بیٹھ جاؤ جب میرا جی سنبھل جائے تو چلی جانا۔

آپاجان : ہائے ہائے، اتنا بھی کیا ہے ننھی ؟

رخشندہ : (محبت سے) آپی تم نہیں جانتیں ہیں — کتنا سہمی جا رہی ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے (سوچتے ہوئے) دُنیا میں، میں ہی ایک عورت تنہا ہوں جس کا خاوند ابھی تک واپس نہیں آیا۔ میں ہی ایک روح سرگرداں ہوں جو صدیوں سے سایے ایسے سُبک اور تیز گام قدموں کے پیچھے دیوانہ وار دوڑ رہی ہے جو اپنے

گوہرِ مقصود کی تلاش میں ازل سے آوارہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے کتنی صحرا نوردی کی ہے
کتنے کوہ و دشت ناپے ہیں! چٹانوں اور کانٹوں کی نوکوں کے چلتے ہوئے
بوسے میرے قدموں پر حاوی ہو گئے ہیں، آپا یہ دیکھو میرے پاؤں! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

آپاجان: اُف! یہ گودنے سے کیا ہیں ننھی ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

رخشندہ: وہ ۔ ۔ ۔ وہ دیکھو ۔ ۔ ۔ وہ ۔ ۔ ۔ ۔ (خلاء میں دیکھنے لگتی ہے)

آپاجان: وہ ۔ ۔ ۔ (اوپر دیکھتے ہوئے) وہ کیا ہے رخشی!

رخشندہ: آپا، کبھی موٹروں کے پہیئے اور ڈھیرے میرے ذہن میں گھوم رہے ہیں، کانوں میں گھر رگھر رکی ایک مسلسل آواز سنائی دیتی ہے۔ جو آناً فاناً ایک دھماکے پر ختم ہو جاتی ہے۔ وہ دیکھو کیا تمھیں کچھ نہیں دکھائی دیتا؟

آپاجان: کیا ہے ۔ ۔ ۔ مجھے تو کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔

رخشندہ: ہاں وہ دیکھو، ہسپتال کی آیوڈین میں بسی ہوئی پیلی پیلی پٹیاں عزرائیل کی زرد بے خون انگلیوں پر چکر لگا رہی ہیں۔ تم جانتی ہو پار سال چچا فیاض کے چوٹ آئی تھی تو ان کی ٹانگ پر پلسٹر جما کر اسے لکڑی کی ایک تختی کے ساتھ باندھ دیا تھا اور وہ کس درد و کرب سے کراہتے تھے۔ ان کی آنکھوں کی دہشت ہمیشہ کے لیے میرے دل پر نقش ہو گئی ہے، اور مجھے اس سے کتنا ڈر معلوم ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ! (بادل کی گرج سنائی دیتی ہے)
آپا، اچھی ! ، مجھے اپنے دامن میں چھپا لو۔

آپاجان: (درد کی ہنسی ہنستے ہوئے) میرے دامن میں چھپو گی؟ میرا دامن اتنا مختصر ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔

رخشندہ: (تاسف سے) اوہ! تمھارا دامن تمھاری رخشندہ پر کبھی تنگ ہو گیا ہے، آپا، یہ مجھے معلوم نہ تھا ۔ ۔ ۔ شادی کے بعد تم اور بے کس بہن بھائیوں کے ساتھ

ایسا سلوک کس قدر افسوسناک ہے کیا اس دامن میں ننھا اور نازی ہی سما سکتے ہیں ؟ یا ... (کچھ کہنا چاہتی ہے، لیکن شرم مانع ہے)

آپا جان: (برافروختہ ہوکر) آخر یہ کیا ہے آدھی رات کے وقت تم دیوانی ہو رہی ہو سب سو رہے ہیں، تو کیا بدتمیزی ہے کہ ذری خلاف توقع مرد کے آنے میں دیر ہوئی تو یوں تنک گئیں۔

رخشندہ: (آواز میں رقت ہے) تمیز! (آواز میں لغزش ہے) اوہ تمیز! کبھی تم لوگ میری تمیز اور سلیقے کی داد دیا کرتے تھے کبھی میری حیا کا چرچا ہوا کرتا تھا جب کسی کا بچانے والا ہاتھ ہٹ جائے تو عورت سے سب عیب منسوب کر دیے جاتے ہیں۔ آپا تم جانتی ہو، جب ابا اللہ کو پیارے ہوئے تو رشتہ داروں نے کونسی تہمتیں تھیں جو اماں جان پہ نہ لگائیں ؟ اگر وہ گھر سے نکلی ہیں تو ان پر انگلیاں اٹھی ہیں، اگر اندر رہی ہیں تو آوازے کسے گئے ہیں۔ اب جن حالات میں میں ہوں ان میں تمیز سے واسطہ ؟ آپا میری تمیز، میری حیا، میری عقل، میرے سہاگ کی باندی ہے۔

آپا جان: تم حیا کا دامن چھوڑ رہی ہو رخشی!

رخشندہ: آپا جان، آج اس مختصر سی بیوگی پر مجھے اپنی بیوہ ماں کے دکھ کا احساس ہوتا ہے۔ تم کیوں نہیں سو جاتیں۔ اماں ؟ ہم اپنی نادانی میں ہمیشہ کہا کرتی تھیں لیکن وہ ایک ٹک چھت کی طرف جہاں سے مالی نے شہد کا چھتا اتارا تھا، تکتی جاتیں اور ....

آپا جان: تم بھی عجیب ہو جو بیوگی کا آزادانہ طور پر ذکر کر رہی ہو حالانکہ عورتیں اس کے تذکرے تک کو برا سمجھتی ہیں، اور اماں جان اپنی دائمی بیوگی پہ اتنی واویلا نہیں کرتیں جتنی تم .....

رخشندہ : تم نے یہ سوچنے کی زحمت کبھی گوارا کی ہے آپا کہ ان کی خاموشی کتنی پُر شور ہے! اُن کے کپڑوں کی ماتم آلود سادگی میں ہزاروں بیواؤں کا سوگ دکھائی دیتا ہے! اُن کی پتھرائی ہوئی نظروں میں ان سینکڑوں عورتوں کی کاہش اور کسک ہے جن کے خاوند گھر نہیں آئے ان سب باتوں کے باوجود ان کے دل کی حدیث میرے قصّے سے علاحدہ ہے۔ اماں جان نے دنیا کی اونچ نیچ دیکھ لی ہے اور سنو اس نے اپنے بہو، بیٹے، بیٹی اور داماد میں اپنا سہاگ پا لیا ہے ——— اور پھر (وقفہ) — پھر — بادل کی گرج سنائی دیتی ہے

آپا جان : اور پھر کیا ؟

رخشندہ : (ڈر کر) میرے اور قریب ہو جاؤ، آپا، پھر اماں جان نے اپنے دل کو سمجھا لیا ہے کہ ابّا جان جنت سے واپس نہیں آنے کے۔ لیکن میں ان کی طرح نہیں سوچ سکتی میری ماں کا خاوند فانی تھا لیکن میرا خاوند غیر فانی ہے۔

آپا جان : (گھبرا کر) رخشندہ یہ کیا بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو ؟

رخشندہ : میں دیوانی تو نہیں آپا!

آپا جان : دیوانہ اپنے زعم میں . . . . . .

رخشندہ : میں ٹھیک کہہ رہی ہوں آپا۔ روح کا خاوند کبھی نہیں مرتا۔ (ایک مریض کی سی ہنسی) لیکن (یکلخت جیسے اس نے نبض کو پا لیا ہو) لیکن ہمیشہ اس کے آگے آگے بھاگتا رہتا ہے جس طرح ازل سے چاند سورج کا تعاقب کر رہا ہے۔ لیکن ہمیشہ سے برابر کا فاصلہ قائم ہے۔ اس طرح روح ازل سے اپنے محبوب کو پکڑنے کے لیے عالم ہستی میں سرگرداں ہے لیکن اسے پکڑ نہیں پاتی۔

(دور سے دولہا بھائی کی آواز آتی ہے دولہا بھائی کا اصول ہے
خوش باش و لے کہ زندگانی این است)
دولہا بھائی: بیوی! آپ آئیں گی یا پانسہ اُلٹ دوں؟
آپا جان: میں کہتی ہوں ذری اِدھر تو آئیے لپک کے۔ ۔ ۔ ۔
دولہا بھائی: اِدھر کیا ہے؟
آپا جان: سلامت بھائی نہیں آئے نورخشی باؤلی ہوئی جارہی ہے۔
دولہا بھائی: ہارہی ہو نہ! اب جبکہ میرا خون خچر ہوا جاتا ہے تو آپ کیا چپکے سے بیٹھ رہی ہیں وہاں!
آپا جان: میں کہہ رہی ہوں سلامت بھائی نہیں آئے ابھی تک۔
دولہا بھائی: رخشی سے کہو سورۂ حمد پڑھے آکر حکم ہی تو صادر کرے گا وہ ہمیشہ کی طرح آئے گا وقت پر! (کچھ قریب آجاتے ہیں)۔
رخشندہ: وقت کب کا ہو چکا دولہا بھائی۔
دولہا بھائی: اہی! ایک بج چکا ہے! ایک جمائی لے کر تو کیا مضائقہ ہے باہر دیکھو۔ موسم بھی تو کتنا خراب ہے کہیں بارش کے تھم جانے کا انتظار کر رہا ہوگا۔
آپا جان: ڈر یہی ہے کہ کہیں موٹر تانگہ کی لپیٹ میں نہ آگئے ہوں۔ ہاں بابا آج کل موٹریں بھی تو کتنے بلیوں کی طرح دوڑتی پھرتی ہیں۔
دولہا بھائی: ارے جانے بھی دو تم نے سلامت میاں کو بچہ سمجھ رکھا ہے؟ کان کاٹتا ہے وہ بڑے بڑوں کے!
رخشندہ: کان کاٹتے ہوں گے لیکن حادثے کو عقل سے نہیں تقدیر سے واسطہ ہوتا ہے، دولہا بھائی:
دولہا بھائی: پھر جو آدمی تقدیر کو مانتے ہیں، انھیں تو تسلیم و رضا کی عادت ڈالنا

اور خوش رہنا چاہیے (بات کا رُخ پلٹ کر) اور میں سوچتا ہوں سلامت کس قدر خوش قسمت ہے (مزا لے کر) رخشندہ ایسی لڑکی اس کا انتظار کرتی ہے! یہ دیکھو رخشندہ یہ بھی تمھاری ہی بہن ہے تا کبھی دس بجے بھی آؤں تو آرام سے پڑی سو رہی ہوتی ہیں!

آپا جان: (خفا ہو کر) میں نے سمجھ لیا ہے تا کہ آپ کے وقت کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے بقول حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے، اور رخشی سلامت بھائی کے متعلق جانتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ کلب میں جاتے ہیں اور اس کے بعد شراب خانے قہوہ خانے میں جھک نہیں مارتے پھرتے، سیدھے ہی گھر کا رُخ کرتے ہیں۔

دولہا بھائی: سنتی ہو رخشندہ؟ سورج غروب ہونے کے بعد کبھی گھر سے باہر نہیں رہا۔ لیکن آپ اس وقت بھی نیند میں مدہوش ہوتی ہیں، اور پھر پہلے پہر کی نیند جگانا تو سوتے ہوئے شیر کو ہاتھ لگانا ہے۔ میں کہتا ہوں اگر کہیں حادثہ ہو جائے تو تین دن کے بعد میری نعش ہسپتال کے مردہ خانے سے ملے۔

آپا جان: (چمک کر) چپ رہیے، آپ کو بات کرنے کا سلیقہ نہیں۔ ہسپتال کے مُردہ خانے کا ذکر کرتے ہوئے کیا آپ رخشندہ کے زخم پر پھایا رکھ رہے ہیں؟

دولہا بھائی: رخشندہ! لڑکی تم مطلق فکر نہ کرو، وہ آتا ہی ہوگا، ذرا بارش تو تھم جانے دو، اور جو انتظار کرنا ہی ٹھہرا تو آؤ! ایک بازی شطرنج کی لگا لیں۔ (جاتے ہیں)

آپا جان: چلو گی؟

رخشندہ: ہوں! شطرنج!

آپا جان: آخر دل جو بہلانا ہوا،

رخشندہ: کیا ایسے میں مجھے شطرنج کی چالیں سوجھیں گی۔

آپا جان: (خفا ہو کر) تم ایسی نادان چھوکریاں ہی مردوں کو خراب کرتی ہیں...... اور خود

بھی خراب ہوتی ہیں۔

رخشندہ: اور اپنی خرابی میں کتنا خوش ہوتی ہیں آپا! خدا دولھا بھائی کو خواجہ خضر کی عمر عطا کرے۔ اور تمھاری گود ہمیشہ ہری رہے۔ جس کی گود میں بچے اور جس کے پہلو میں اس کا چاہنے والا ہو اسے کیا پڑی ہے کہ جو دوسرے کے غم کو اپنا غم سمجھے۔

جس کے پیر پھٹے نہ بوائی
وہ کیا جانے پیر پرائی

آپا جان: تمھاری نگاہ میں میرے بچے اور میرا شوہر ہو رخشندہ! کیا تمھیں شرم نہیں آتی جو اپنے حسد و بغض کا کھلے بندوں اظہار کرنے لگو؟ یہ تمھاری وجہ سے ہے کہ وہ میری طرف سے بے اعتنا رہتے ہیں۔

رخشندہ: میری وجہ سے؟

آپا جان: ارے توبہ توبہ! خدائی بھر میں کوئی تم ایسی باتیں سن کر صبر اور سکون کا دامن تھامے رکھے گا؟ میں تو تمھیں اپنی بہن ہی سمجھتی تھی مگر تم تو خاصی سوت ہو!

رخشندہ: (چیخ مار کر) آپا ـــــ!

آپا جان: چل اپنے کمرے کے اندر جا کے سورۃ تیرے پاگل پنے کا ایک ہی جواب ہے۔

(زور سے دروازہ بند کر دیتی ہے)

رخشندہ: (جیسے یقین نہیں آتا) دروازہ بند کر دیا! مجھ پر میری اپنی بہن نے دروازہ بند کر دیا!

(پردہ)

دوسرا منظر

رخشندہ کے بھائی جان اور ان کی بھابی کا کمرہ۔

کمرے میں مدھم سی روشنی ہے جس میں کمرے کے عین درمیان دو پلنگ دکھائی دیتے ہیں۔ ایک پلنگ پر بھائی جان بیٹھے گھٹنوں تک دوشالہ اوڑھے سگریٹ پی رہے ہیں۔ پاس ہی ایک ڈائمنڈ کٹ کے ایک خوبصورت گلاس میں ایک رنگین سی چیز پڑی ہے ...... بیگم (رخشندہ کی بھابی) سے باتیں کرتے ہوئے وہ گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ پی لیتے ہیں۔

باہر بارش کی آواز اور بادل کی گرج برابر سنائی دے رہی تھی کچھ دیر بعد رخشندہ کی بھابی اپنے میاں کی بغل سے اٹھ کر دروازے کے قریب پہنچتی نظر آتی ہے۔ پہلے وہ روشندان کی رسی کو کھینچتی ہے تاکہ پانی کی بوچھاڑ کمرے میں گر کر قالین (؟) کو خراب نہ کر دے۔ پھر وہ دروازے کے پاس کھڑکی کی پچھلی چٹخنی کو بھی بند کر دیتی ہے اور درزوں میں کاغذ ڈال دیتی ہے۔ اس کے بعد وہ پلنگ کی دوسری طرف بیٹھ جاتی ہے اور دوشالہ اپنے گھٹنوں تک کھینچ لیتی ہے۔

ان دونوں میاں بیوی کی زندگی کا یہ نہایت پُر کیف لمحہ ہے باہر بارش ہے۔ سردی ہے اور ان دونوں کو عشق و محبت کی گرمی میسر ہے۔ انہیں کچھ اس قسم کا حظ حاصل ہو رہا ہے جیسے سردیوں کی صبح جاگنے کے بعد کسی شخص کو چائے کا ایک گرم گرم پیالہ پینے سے حاصل ہوتا ہے۔ اور اگر اس میں تھوڑی سی مٹھاس بھی مل جائے تو ....

بھابی : کتنی خوفناک رات ہے، طوفان بڑھتا ہی جا رہا ہے!
بھائی جان : درختوں کے دیو وحشتناک سیٹیاں بجا رہے ہیں۔ جیسے خوفناک گھنے جنگل میں رہزن کسی مسافر کو دیکھ کر اشارے کرتے ہیں۔
بھابی : کالے بادلوں میں بجلی کی کوند کتنی بھیانک معلوم ہوتی ہے۔ جانور بیچارے اپنے گھونسلوں میں کیا کرتے ہوں گے؟ ہماری چھت کی کارنس پر جو کبوتر کا جوڑا رہتا ہے ....
بھائی جان : ع ڈرا رہے ہیں پروں سے نشیمن کو رات بھر ... کر کیا سکتے ہیں بیچارے؟
بھابی : ہمارا بھی ننھا سا گھونسلا .....
بھائی جان : کتنا اچھا ہے! ..... جس میں ہم اور تم زندگی کے حسین لمحے کاٹ رہے ہیں، زندگی کے حسین لمحے وہی ہوتے ہیں جب باہر طوفان ہو حالات ناموافق ہوں، لیکن محبت کرنے والے دل ان سب باتوں سے بے خبر اپنی ننھی سی دنیا میں مگن ہوں ....
بھابی : اور اس لمحے چاہیے نشیمن پر بجلی گر جائے ... آہ ... کس قدر موزوں ترین خاتمہ ہے۔

(دروازہ پر دستک سنائی دیتی ہے)

بھابی : کون ہے؟
بھائی جان : بجلی —
بھابی : لیکن ایسی بجلی جو ہمارا خاتمہ نہ کر سکے گی۔
رخشندہ : (رخشندہ کی آواز) بھائی جان؟ .... بھائی جان!
بھائی جان : کون ہے اس وقت (رک کر) رخشی معلوم ہوتی ہے! لیکن یہ کیا الجھن ہے۔ کہ رات کے تیسرے پہر ....؟ .....

بھابی : بے وقت کی شہنائی ! ــــ

بھائی جان : (ایک طویل سرد آہ بھرتے ہوئے) اس کی زندگی بھی سونے جاگنے کا ایک ناتمام افسانہ ہے۔

بھابی : (اظہارِ ناپسندیدگی میں) چاہے بہن ہی ہے آپ کی، لیکن ایک بات میں ضرور کہوں گی کہ اسے وقت کی تمیز نہیں۔ اِس بھرے گھر میں جہاں بڑے بھی ہیں اور چھوٹے بھی ہمیں اکیلے بیٹھنے کا موقع ہی کب ملتا ہے۔ میں نے آزما کر دیکھا ہے جب ہم دونوں اکیلے ہوتے ہیں، تو ضرور آ دھمکتی ہے۔

بھائی جان : بُری عادت ہے۔ لیکن . . . .

بھابی : ہاں . . . . لیکن . . . . آپ تو اس کا جواز تلاش کر ہی لیں گے۔ دنیا میں کوئی ایسی بات ہے بھی جس کا جواز نہ پیش کیا جاسکے میرے سبھی بھائی ہیں لیکن کیا مجال جو میری پاس داری کریں۔ ان کے نزدیک ہمیشہ وہی سچ ہوتا ہے جو بھابی جان کہتی ہیں اس لحاظ سے رخشندہ واقعی رخشندہ اختر ہے ــــ !

بھائی جان : میں محض جواز نہیں پیدا کر رہا !

رخشندہ کی آواز : (زیادہ مضطرب) ــ بھائی جان ! بھابی ! خدا کے لیے دروازہ کھول دیجیے۔

بھائی جان : رخشندہ کی آواز میں غیر معمولی گھبراہٹ نہیں سنائی دیتی کیا ؟

بھابی : اس کی آواز گھبراہٹ سے خالی کب ہوتی ہے ؟ وہ ہمیشہ بات یوں شروع کرتی ہے جیسے کوئی حادثہ رونما ہوگیا ہے اس کی کھوئی کھوئی نگاہوں سے ہمیشہ یہ پتا چلتا ہے کہ اس نے ایک عظیم الشان سلطنت کھو دی ہے۔ ایسی سلطنت جو کبھی اس کی ملکیت نہ تھی . . . .

بھائی جان : ۔ فصاحت کے دفتر پھر کھول دینا۔ دیکھو تو سہی ماجرا کیا ہے ؟ دروازہ

کھولو۔

(دروازے تک پہنچتے ہوئے، بھابی اس انداز سے پوچھتی ہیں گویا انھوں نے دستک کو پہلی بار سن پایا ہے۔ رخشندہ کی آواز آپا جان کے سلوک کی وجہ سے زیادہ ہی معذرت سے بھرا اور صدمہ زدہ ہوگئی ہے)

بھابی : کون ہے ... ؟ (دروازہ کھولتی ہے)

رخشندہ : میں ہوں ایک بھک منگی۔

بھابی : بھک منگی ؟

رخشندہ : ہاں میں تم لوگوں سے بھیک مانگنے آئی ہوں بھابی ! تم فقط میری بھابی ہی نہیں ہو۔ پھوپھی زاد ہونے کی وجہ سے تم میری چھوٹی بہن بھی ہو۔ بہت سی باتیں جو میں اماں جان سے نہیں کر سکتی۔ وہ میں نے تمھارے ساتھ کی ہیں میرے کئی راز تمھارے کانوں کے گوشوارے ہیں۔

بھابی : کیا بات ہے آپا؟ خدا کے لیے مجھے پہیلیاں نہ بجھواؤ میں بھی تمھاری طرح گھبرا رہی ہوں۔

رخشندہ : تم .... تم میری مصیبت کا اندازہ لگا سکتی ہو۔ بھائی جان کو دیر سے گھر آنے کی عادت ہے۔ بھابی جب بھائی جان نہیں آتے تو کیا تمھاری نگاہیں دروازے کی طرف دیکھتے دیکھتے پتھرانے نہیں لگتیں.... ؟ کیا تمھیں ہر حرکت میں صدیوں سے ایک مانوس آہٹ نہیں سنائی دیتی ؟

بھابی : سنائی دیتی ہے آپا لیکن .....

رخشندہ : کیا تم باتیں کرتی ہوئی بھٹک نہیں جاتیں ؟ کیا تمھارے کردار اور گفتار میں فرق نہیں پڑتا ؟ کیا تمھیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ دنیا بھر میں تم ہی ایک

ایسی عورت ہو جس کا خاوند واپس نہیں آیا کیا تمھارا فکر تمھاری حربی کا چراغ جلا کر راہگذاروں نتا ہرا ہوں، اسپتالوں میں تمہیں ڈھونڈا کرتا؟ کیا تمھیں یوں نہیں دکھائی دیتا جیسے تم صدیوں سے آوارہ ہو رہی ہو اور تمھارے عزیز اپنے نرم و گرم گھونسلے میں پڑے تمھاری مصیبت کا خیال نہیں کرتے۔

آہ! روح اس تجسّس تا ابد میں کتنا وقار کھو دیتی ہے! وہ کتنی کم ظرف ہو جاتی ہے۔

بھابی: مشکل ہی سے کوئی عورت ہو گی جو اپنے خاوند کی اس بے اعتنائی کو دیکھ کر چُپ رہے۔ عورتیں ہمیشہ اس بات سے خفا ہوتی ہیں لیکن سوچو تو یہی ایک لطیف بنیاد ہے جس پر حبیب و محبوب کی محبت کا محل کھڑا ہے ہاتھ پسارو اور تمھیں محبوب مل جائے ... تو روح کی مقدس آگ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جاتی ہے۔

رخشندہ: بھابی! میں تمھارے ہاتھ چومتی ہوں۔ آؤ۔ مجھ سے لپٹ جاؤ۔ تمھارے اس فقرے میں کتنی پیغمبرانہ شان ہے۔ لیکن وہ کدھر ہیں؟ اب انتظار کی وحشت مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ مجھ سے مذاق نہ کرو۔ مجھے میرا شوہر دے دو، مجھے میرا شوہر دے دو۔

بھائی جان: (حچر حامد ساکت سب باتیں سن رہے ہیں) رخشندہ اختر!

رخشندہ: آپ لوگوں نے اسے کہیں چھپا رکھا ہے۔ وہ دیکھو بستر اُکھڑا ہوا ہے (دوڑ کر بستر تک پہنچتی ہے) کیوں یہاں کچھ بھی نہیں؟

بھائی جان: رخشی، رخشی۔ بیوی رخشی کے کپڑے بھیگ رہے ہیں۔

بھابی: ہاں ساری شلوار گیلی ہو گئی جاتی ہے۔ برآمدے میں کھڑے رہنے کی وجہ سے

چھینٹا پڑ گیا ہے۔

بھائی جان: یہ سب اس لیے ہے کہ تم نے اپنی بحث طرازی میں دروازہ جلدی سے نہیں کھولا۔

رخشندہ: وہ پردے ہی میں رہے ہیں۔ وہ پردے کی تہوں میں چھپ گئے ہوں گے (بھاگتی ہے) لیکن ان بازووں میں ہوا کے سوا کچھ بھی نہیں۔ وہ یہیں تھے لیکن دروازہ کھلتے ہی کہیں غائب ہو گئے ہیں۔ میں مر کر ان پردوں کو ہمیشہ ہلاتی رہوں گی۔ ان دروازوں کے اندر باہر ہمیشہ کے لیے گھومتی رہ جاؤں گی۔

بھائی جان: (ڈر کر) رخشی، رخشی۔

بھابی: میں کہتی ہوں، انھیں جھنجھوڑیے۔۔۔۔ اور۔۔۔۔

رخشندہ: راستہ کدھر ہے؟ تم لوگ کیوں بحرِ ظلمات میں غوطہ کھا رہے ہو۔ بتّی جلاؤ۔

بھابی: بتّی جل رہی ہے۔

بھائی جان: بتّی جل رہی ہے (گھبرا کر) بتّی جل رہی ہے۔

رخشندہ: راستہ کدھر ہے؟ میں انھیں مدتوں سے ڈھونڈھ رہی ہوں۔ میں ان کے طور طریقے سے واقف ہوں۔ ایک نظر دکھائی دے کر پھر گم ہو جانا ان کا شیوہ ہے۔

بھائی جان: سلامت بھائی ابھی تک نہیں آئے۔ ان کو تو دیر لگانے کی عادت نہیں۔

بھابی: آ گئیں ہائیں۔ اب مردوں پر حکم تھوڑے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ ایسے ہی جیسے آپا کو کسی ضابطے کا پابند کیا جا سکتا ہے۔

بھائی جان: مجھے پتا ہو کہ کسی کی یہ غیر حالت ہو سکتی ہے تو میں کبھی دیر نہ لگایا کروں گا

بھابی: اس طرح ہوتا ہے کسی میں کم، کسی میں زیادہ۔ تعجب ہے! سلامت بھائی ہو کہاں سکتے ہیں اس وقت؟

بھائی جان : شہاب گنج میں ایک سیّد زادہ ہے۔ اس سے گاڑھی چھنتی ہے ان کی
کیا معلوم جو موسم کی خرابی کی وجہ سے وہیں ٹھہر گئے ہوں۔

بھابی : جب اپنے گھر کے آدمیوں کا پتا ہو تو پھر کسی صورت نہیں رکنا چاہیے۔

بھائی جان : یا انھیں لائبریری میں چمڑے کی جلدوں کی بُو اچھی لگتی ہے۔

بھابی : لیکن لائبریری تو نو بجے بند ہو جاتی ہے۔

بھائی جان : اور بارش آٹھ بجے سے ہو رہی ہے لیکن سلامت اپنے کپڑوں کو کسی
طرح بھی خراب کرنے والے نہیں۔

بھابی : اشرفیاں لٹیں، کوئلوں پر مُہر! رخشندہ ایک طرف اور کپڑے دوسری طرف چچی!

بھائی جان : البتہ سینما کے دوسرے شو میں نہ چلے گئے ہوں۔

بھابی : لیکن کتنا غیر ذمہ دارانہ رویّہ ہے۔ اچھی طرح سے جانتے ہیں لاڈلی کو۔ اسے تو
تعویذ بنا کر گلے میں ڈال لیا ہوتا۔

رخشندہ : (آواز میں رقّت ہے) بھائی جان۔ اللہ نے مجھے اور آپ کو ایک ہی خون
سے بنایا ہے۔ لیکن ان کے نہ آنے سے آپ کا خون کیوں بے حس رہتا ہے؟
اس میں بے تار برقی کا عمل کیوں نہیں؟ کیوں ہر بار میری ہی گردن غم و اندوہ
کی کُند چھری سے ریتی جاتی ہے۔ آپ کیوں نہیں سامنے پڑا ہوا چھاتا لے کر
نکل جاتے اور انھیں ڈھونڈ لاتے؟

بھابی : پتا کبھی ہو سلامت ہیں کہاں۔ اور پھر چھاتا بھی ٹھیک حالت میں نہیں ہے۔

رخشندہ : برساتی۔ بھائی جان! برساتی کیوں نہیں پہن لیتے؟

بھابی : ہونہہ! جدِ امجد کے وقت کی برساتی خرید رکھی ہے۔ وہ کیا چھینٹے کو
روک سکتی ہے؟

بھائی جان : اور ایسے میں تو چھاتا بھی بے بضاعت ثابت ہوتا ہے۔

بھابی : اچھی حالت میں بھی ہو تو اُلٹ جاتا ہے اور بد سانی میں گردن کے قریب ایک بڑا سا سوراخ
کھلی ہے۔

رخشندہ : راستہ! راستہ! جب روح اپنے مالک کا پیچھا کرتی ہے۔ تو رات کس قدر
اندھیری ہو جاتی ہے۔ دنیا کے چاروں کونوں سے طوفان اُمنڈ آتے ہیں خرمن
سوز بجلیاں کوندنے لگتی ہیں۔ کائنات کا ذرہ ذرہ مخالفت پر تُل جاتا ہے۔ سگی
بہن کو آڑ بند کر لیتی ہے۔ بھائیوں کے چھاتے اُلٹے جاتے ہیں اور بد نصیب روح۔

بھابی : آپا معاف کیجیے۔ آپ کو دوسروں کے برتن میں گدلا پانی کھنگالنے کی بہت بُری
عادت ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ کو اپنے بھائی کی نسبت اپنا شوہر زیادہ
عزیز ہے۔ نہ جانے شادی کے بعد بہنوں کو کیا ہو جاتا ہے؟ ماں باپ بہن
بھائی سب شوہر کے مقابلے میں ہیچ دکھائی دینے لگتے ہیں۔

رخشندہ : مجھے میرے ہی خنجر سے حلال نہ کرو بھابی۔ تم یہ سب باتیں ایسے کر رہی ہو
بھابی جیسے تم کسی کی بہن نہیں ہو۔ لیکن (رونے لگتی ہے) زندگی کی شمع
زندگی سے ہی جلتی ہے۔ ڈوبتے ہوئے آدمی کو بچانے کے لیے ایک خطرے
سے باہر انسان کو اپنی جان جوکھم میں ڈالنا ہوتی ہے۔ اگر یہ پتا ہو کہ دوسرا
آدمی ڈوب ہی چکا ہے تو کوئی نامحرم کو بھی چھلانگ لگانے کے لیے نہ کہے۔ آہ
بھابی! تم لوگ ایک بیقرار روح کو کتنا غلط سمجھتے ہو!

(ننھے میاں داخل ہوتے ہیں)

ننھے میاں : یہ کیا اودھم سا مچ رہا ہے ادھر؟

بھابی : وہی روز مرّہ ننھے میاں!

ننھے میاں : آپا کیوں پاگلوں کی طرح چیخ رہی ہے؟

رخشندہ : میں ہی قسمت کی ماری ہوئی ہوں ننھے میاں! ہر روز مجھے تلنے کے لیے

زمانے کی کڑاہی میں نیا تیل ڈالا جاتا ہے۔ ہر روز میرے لیے ایک المناک
افسانہ کھڑا ہوتا ہے۔

ننھے میاں : آج کیا بات ہے؟

بھائی جان : بات کیا ہو گی۔ سلامت بھائی نہیں آئے۔

ننھے میاں : تو اتنا شور مچانے کی کیا ضرورت ہے؟ پرسوں میرا امتحان ہے اور
میں ایک لفظ بھی تو نہیں پڑھ سکتا۔ بھائی جان آجائیں گے کوئی بچہ
تو نہیں ہیں۔

رخشندہ : ننھے میاں۔ کیا تم بھی اس قبیح سازش میں شریک ہو؟ کیا تم بھی اس غلیظ اسٹیج
پر کھیلے جانے والے ڈرامے کے ایک ولین ہو؟

بھائی جان : (اونچی آواز میں) رخشندہ بہن اپنی زبان کو قابو میں رکھنا چاہیے۔

ننھے میاں : بھائی جان برہم ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ آپا کو اچھی طرح سے جانتے
ہوئے بھی نہیں جان رہے ہیں۔ (نہایت محبت سے) آپا جان۔ کیا چاہتی
ہیں آپ؟

رخشندہ : (ہمدردی کے الفاظ سن کر بھڑک اٹھتی ہے) میں کیا چاہتی ہوں؟ لذت
خود دے کر مجھ ہی سے پوچھتے ہیں کہ میں۔ . . . آہ!! تم سب بہن بھائی
گرگ باراں دیدہ ہو۔

ننھے میاں : لیکن آپا! . . . . .

رخشندہ : میں کسی کو انہیں تلاش کرنے کے لیے مجبور نہیں کرتی میں خود چلی جاتی
ہوں۔ لیکن تم لوگ مجھے یوں سڑکوں پر جاتے ہوئے دیکھ کر بھی تو برداشت
نہیں کرتے۔ خود جاؤ یا مجھے جانے دو۔ ننھے میاں تم میرے چھوٹے بھائی
ہو کیا تم پر بھی میں کوئی حق نہیں رکھتی؟ تمہیں رد کرنے والی تو یہاں کوئی

نہیں ہے۔

بھابی: دیکھو آپا! . . . .

ننھے میاں: بھابی! آپ پھر بولنے لگیں۔ آپ معاملے کی نزاکت کو نہیں سمجھ سکتیں۔ لایئے کدھر ہے چھاتا اور برساتی؟

بھائی جان: (ندامت سے) باہر جانے سے تو میں نہیں گھبراتا، البتہ مجھے . . . .

بھابی: چھاتا اور برساتی وہ دونوں سامنے کپڑوں والی الماری میں پڑے ہیں۔

(ننھے میاں جاتے ہیں)

رخشندہ: (پھر خلا میں دیکھتے ہوئے) کارواں! کارواں جا رہا ہے، مجھے اپنے کانوں میں گھنٹیوں کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ کارواں چلا گیا، اور میں ریگِ صحرا پھانک رہی ہوں۔

بھابی: (حیران ہو کر) آپا کو کشف ہو رہا ہے؟

بھائی جان: (حیران ہو کر) کشف ہو رہا ہے؟

بھابی: آپ دیکھتے نہیں ان کی نگاہیں کس طرح ایک نقطے پر جمی ہوئی ہیں . . . . وہ اس دیوار کے پار اس طرح دیکھ رہی ہیں، جیسے وہ شیشے میں سے جھانک رہی ہوں (وحشت زدہ ہو کر) ان کی نظریں دل و جود کو چیر رہی ہیں۔

بھائی جان: بیوی . . . . رخشی کو کیا ہو گیا ہے؟ خدارا اس کے کپڑے بدل ڈالو! ورنہ یہ سردی میں مر جائے گی۔ دیکھو اس کے ہونٹ نیلے ہو رہے ہیں۔

رخشندہ: کپڑے! (ہنس کر) میں نے پہلے ہی اپنے جسم کو تم زمینیوں کے کپڑوں سے آلودہ کر رکھا ہے (نفرت سے) تم لوگوں نے پہلے ہی مجھے جو جسم دے رکھا ہے وہ ایک چیتھڑے سے زیادہ نہیں وہ سال میں بارہ مہینے نزلہ اور درد سر میں مبتلا رہتا ہے (آشفتہ) میں محض ایک جسم سے کچھ زیادہ ہوں! لیکن میں کہاں تک کہوں؟

کہاں تھی ؟ اور کدھر چلی آئی ؟ (دیوانہ وار ناچتے ہوئے)

"جب سے ہوں میں نیستاں سے بے وطن"

(ناچنے لگتی ہے)

بھائی جان: بیوی! مجھ سے یہ نہیں سہا جاتا۔ تم زبردستی رخشندہ کے کپڑے بدل ڈالو۔ میں اماں جان کو اطلاع دیتا ہوں۔

بھابی: میرے ہاتھ پاؤں بھی پھولنے لگے ہیں، آپ آپا کے چہرے کا جلال نہیں دیکھ رہے؟ اوہ!... میری آنکھیں تو خیرہ ہوئی جاتی ہیں۔

رخشندہ: یہ روح کا ناچ ہے! روح کا ناچ! روح جب اپنے ازلی خاوند، اپنے اصل سے جدا ہوتی ہے۔ تو پھر اس کے وصال کے لیے بھٹکتی پھرتی ہے!

(گاتی ہے)

جب[1] سے ہوں میں نیستاں سے بے وطن

ہیں مرے شیون سے نالاں مرد و زن

بھائی جان: (ڈر کر) رخشندہ مجسم رخشندہ ہوئی جا رہی ہے۔

بھابی: (تنا تنا سے) آپ سلامت بھائی کو ڈھونڈنے چلے جائیے۔ چلے جائیے!

بھائی جان: اب چھپاتا بھی نہیں اور نہ برساتی۔

بھابی: پروانہ کیجیے! مجھے یوں معلوم ہوتا ہے، جیسے آپ بھی باہر سے واپس نہیں آئے اگر سلامت بھائی آ گئے تو میں سمجھوں گی آپ بھی آ گئے

بھائی جان: میں چلتا ہوں، لیکن رخشندہ آناً فاناً چپ ہو گئی ہے، کیوں؟ آخر کیوں؟

---

[1] کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند ؛ از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند (مولانا روم مثنوی)

بھابی : جیسے صدف نے گوہر کو لے کر اپنا منہ بند کر لیا ہے۔ میں کپڑے بدلتی ہوں آپ
امّاں جان کو خبر کر دیجیے جائیے!
رخشندہ : میں کپڑے نہیں بدلنے دوں گی (ننھے میاں داخل ہوتے ہیں۔ طوفان کی
آواز آتی ہے)
ننھّے میاں : (ہانپتے ہوئے غصّے کے اظہار میں) میں سر سے پانو تک بھیگ [illegible]
میں کہتا ہوں یہ کیا بیہودگی ہے؟
بھائی جان : بیہودگی کیا؟
بھابی : سلامت بھائی نہیں ملے؟
ننھّے میاں : میں چوک سے پرے نہیں گیا کہ چھاتا اُلٹ گیا۔ برساتی پر قناعت کی
لیکن اس میں بھی کپڑے بھیگ گئے۔ آپا باہر طوفان نہیں دیکھتیں؟ (غصّے
میں) یہ آپا رخشندہ کی سراسر زیادتی ہے اب میں خواہ نمونیہ میں مبتلا ہو جاؤں
بھابی : ننھے میاں تمھارا بال بیکا نہیں ہونے کا۔
ننھّے میاں : لیکن یہ کتنی بدتمیزی ہے۔ ذاتی طور پر میں تو زندگی بھر ایسی لڑکی سے
شادی نہ کروں جو اپنے شوہر کو اتنی بھی آزادی نہ دے سکے کہ وہ ایسے میں باہر
ٹھہر جائے۔
بھائی جان : خطرہ حادثہ کا ہے ننھے میاں۔
بھابی : ہاں، حادثے کا ہی ورنہ!
ننھّے میاں : اگر سلامت بھائی کا بال بیکا ہو تو آپ مجھ سے کہہ لیں۔
رخشندہ : (آنا فانا ہیں مرے شیون سے نالاں مرد و زن
رنا چتے ہوئے) مرد و زن! مرد و زن!! مرد و زن!!!
ننھّے میاں : آپا کو کیا ہو گیا ہے۔ امّاں کو بلاؤ۔۔۔فوراً۔ امّاں جان کو۔

بھائی جان : بیگم تم کپڑے بدل دو ہم دونوں جاتے ہیں۔ (جاتے ہیں)

بھابی : آپا۔ آپا مجھے بخش دو۔ میں نہیں جانتی تھی کہ تو مجسّم روح ہے روح! ہم سب جسم ہیں، جسم۔ ہم اس جسم سے کبھی اوپر نہیں اٹھتے۔

رخشندہ : بھابی... وہ آ رہے ہیں.... وہ آ رہے ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے دلی راستے میں بیٹھے ہیں اور میں بھاگی جا رہی ہوں...

بھابی : آپا.... آپا.... اپنے مبارک قدموں پر مجھے اپنی گناہ آلود جبیں رگڑنے دو۔ میں نہیں جانتی تھی کہ تو ____

(آپا جان، دولھا بھائی، بھائی جان اور امّاں جان اور گھر کے بہت سے آدمی بھاگے آ رہے ہیں۔ سب کے سب سخت گھبرائے ہوئے ہیں۔)

امّاں جان : رخشی! رخشی بیٹا! (چیخ مار کر) ہائے!

آپا جان : رخشی! رخشی!!

دولھا بھائی : رخشندہ ہیں سچ مچ؟

آپا جان : امّاں۔ رخشی کو مار ڈالنے کی میں ذمّہ دار ہوں۔ اس کا خون میری گردن پر ہے۔ لیکن میں کیا جانتی تھی مشیت کی ماری...

امّاں جان : رخشی بیٹی! ہائے بیٹی! ایک دفعہ تو آنکھیں کھول کر دیکھ لے (روتی ہے)

بھائی جان : (روتے ہوئے) رخشی!

ننھے میاں : (بلند آواز میں) آپا۔

امّاں جان : بیٹی — بیٹی!!

رخشندہ : (نہایت کمزور آواز میں) امّاں!

بھابی : امّاں جان! آپ کی بیٹی کوئی ولی اللہ ہے۔ اس کے چہرے کا جلال نہیں دیکھتیں آپ؟

دولھا بھائی: تم عورتیں کتنی ضعیف الاعتقاد ہو۔ اسے سردی لگ گئی ہے اور بس
آپا جان: کمبل اوپر کر دو۔ ہائے میں نصیبوں جلی۔
بھائی جان: (نوکر کو آواز دیتے ہوئے) کرامت۔ ابے کرامت۔ وہ انگیٹھی سرکانا۔
امّاں جان: دودھ کا ایک گھونٹ ہے کہیں۔۔۔
بھابی: ہاں امّاں جان۔ میں رات چولہے میں ایک گلاس رکھ آئی تھی۔ دودھ لاد و ننھے
میاں: (ننھے میاں جاتے ہیں)
امّاں جان: رخشی، کیوں کیا ہوا میرے بیٹے کو؟
رخشندہ: (ویسے ہی نحیف آواز میں) امّاں مجھے میرے کمرے میں لے چلیو۔
امّاں جان: (ڈر کی جگہ غصّہ لے لیتا ہے) آج آلے سلامت۔ میں اس کی وہ خبر لوں گی کہ یاد کرے گا۔ میں نے آج تک اپنے کسی داماد کو کچھ نہیں کہا تھا۔ لیکن آج میں نے اس کے بال نہ نوچ ڈالے تو۔۔۔
بھائی جان: واقعی یہ کیا بد تمیزی ہے کہ۔۔۔؟
دولھا بھائی: ارے رہنے دو یار! اس بیچارے کو کیا معلوم کہ رخشندہ اتنی پاگل ہے؟
آپا جان: لیکن ایسا بھی کیا؟ آپ اپنے رانا کے سیر سپاٹوں کا جواز پیدا کر رہے ہیں تو علاحدہ بات ہے۔
بھائی جان: مانا باہر ٹھہر گئے۔ لیکن اطلاع تو ہو۔
بھابی: باہر ٹھہر ہی کیوں گئے بھلا؟
ننھے میاں، امّاں جان: یہ لیجیے گرم گرم دودھ حلق میں ٹپکا دیجیے۔ اس چمچے سے۔
امّاں جان: رخشی بیٹیا!
رخشندہ: امّاں جان! اس تھوڑے سے عرصے میں، میں ان سب حقیقتوں سے واقف ہو چکی ہوں۔ سب حجاب اٹھ چکے ہیں۔

آپا: روح کو جسم کو بیماری سہنا ہی پڑتی ہے۔

رخشندہ: میں کسی پر الزام نہیں دھرتی بھابی۔ یہ اپنے ہی لینے دینے کے سمبندھ ہوتے ہیں۔ پھر بیمار روح کبھی تو جسم کا حلیہ بگاڑ دیتی ہے۔ امّاں! وہ آئیں ہیں یا نہیں؟

امّاں جان: اللہ جانے کہاں عاقبت کے بوریے بٹور رہا ہے۔

رخشندہ: تو مجھے طفل تسلیوں پہ جینے دو اماں۔ تم میری شادی کا ذکر کرو۔ میری شادی کا۔

امّاں جان: شادی کا؟

رخشندہ: تم لوگ میرے ارد گرد ست کھڑے ہو جاؤ۔ ہاں امّاں جان! شادی کا!

آپا جان: رخشی ۔ ۔ ۔ ۔

بھائی جان: رخشی!

ننھے میاں: آپا! (سسکیاں لیتا ہے)

امّاں جان: ابھی کل کی ہی تو بات ہے تمھاری شادی تمھارے ابا نے شادی ٹھہرائی (ایک معنی خیز وقفہ جس میں امّاں جان کے ضبط کا احساس ہوتا ہے) منگنی کر دی، سامان درست کیا، اور اپنی بیٹی کو مانجھے بٹھایا۔

رخشندہ: پھر [illegible] اماں [illegible] وہ دن یاد آ رہے ہیں؟ اور جی میں ایک شرط سا [illegible] اماں ــــــ

امّاں جان: [illegible] آئی [illegible] واچڑھا۔ پھر تمھارے گورے گورے [illegible] دیکھو، میری دلھن کے ناخنوں میں [illegible]

[illegible] دیکھ رہی ہے) میری انگلیوں کی پوریں تو

زرد ہیں، بالکل زرد!

امّاں جان: چل ہٹ — پگلی ہوئی جاتی ہے کیا؟

آپا جان: (سسکیاں لیتے ہوئے) رخشی، ہائے!

امّاں جان: اری تو کیوں رونے لگی؟ یہ بڑا دلاسا دینے آئی تھی۔

آپا جان: میں آپ کی مجرم ہوں — اماں!

امّاں جان: بڑی کو پرے لے جاؤ بیٹیا (رخشی سے) رخشی بیٹیا!

رخشندہ: پھر کیا ہوا؟

اماں جان: پھر برات آئی۔ دروازے پر دھما چوکڑی مچی۔ سمدھنیں نئے جوڑے پہنے ہوئے اُتریں۔ اُدھر گالیوں کی بارش ہوئی، اِدھر ڈومنیوں نے گا گا کر ناچا اور ناچ ناچ کر گایا۔

بھائی (روتے ہوئے) امّاں مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا!

ننھے میاں: (روتے ہوئے) کیا ہو گیا ہے آپا کو امّاں؟

امّاں جان: خاموش! (آواز میں رقت ہے) پھر تمھارا نکاح پڑھا گیا گوری گوری ناک میں سبک سی ہیرے کی کیل۔ ہاتھ میں کڑے۔ پاؤں میں چھڑے۔ چھم چھم کرتی ہوئی چلیں تم۔

رخشندہ: امّاں کتنا اچھا دن تھا!

بھائی جان: اوہ امّاں جان، میرا دل بیٹھا جا رہا ہے!

رخشندہ: امّاں تمھارا بھی بیاہ ہوا تھا اسی طرح؟

امّاں جان: (معنی خیز خاموشی) — (ہچکی)

رخشندہ: امّاں جان بولتیں نہیں؟ مُنہ سے دوپٹّہ اُٹھا دو تاکہ میں تمھارا مُنہ اچھی طرح سے دیکھ سکوں۔

اماں جان : (رو کر ، ہاں بیٹی ۔ اسی طرح ہوا تھا ۔ اسی طرح ۔

درخشندہ : لیکن اب ؟

اماں جان : اب کیا ؟ (اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہوئے) اب کچھ بھی نہیں (گھبرا کر اور اپنے فقرے کے معنی سمجھتے ہوئے) اب سب کچھ ہے (محبت سے) بیٹا یہ دیکھو اب میرے ہاتھوں کا حنائی رنگ تمھارے ہاتھوں پر نظر آرہا ہے !

درخشندہ : امّاں تم کتنی فراخ دل ہو۔ میں تو کبھی اپنا رنگ کسی کو نہ دوں ۔

امّاں جان : (رو کر) دراصل کوئی عورت اتنی فراخ دل نہیں ہوتی ۔ لیکن ، اچھا اب تم سو جاؤ ۔ آرام تمھارے حق میں مفید ثابت ہوگا ۔

درخشندہ : امّاں جان ، میں سمجھتی ہوں ۔ میں سب کچھ سمجھتی ہوں ، مجھے میرے کمرے میں چھوڑ آؤ ۔ میں آرام سے سو جاؤں گی ۔ . . . میں ناحق تم لوگوں کی پریشانی کا باعث ہو رہی ہوں ۔ لیکن میں کیا کروں ۔

(سب چلے جاتے ہیں) . . . . . (وقفہ)

امّاں جان : (یہیں بستر پہ لیٹ جاؤ ۔ (سامنے بستر پہ لٹا دیتی ہیں ۔ ایک طرف سے "آپا" داخل ہوتے ہیں ——— آپا نیم غنودگی کی حالت میں ہیں)

آپا : کوئی ہے ؟ پیاس لگ رہی ہے ۔

امّاں جان : ارے سلامت !

دولھا بھائی : سلامت ۔

آپا : سلامت بھائی ۔

بھائی جان : بھائی جان آپ یہیں تھے ؟

(سب بھونچکا رہ جاتے ہیں)

درخشندہ : (اٹھتے ہوئے) آپا ؟ . . . . آپا ؟ . . . . آپ کہاں تھے ؟

(پھوٹ پڑتی ہے) کہاں تھے آپ ؟

آپ : میں یہیں تھا — کیوں کیا ہوا ؟ کیا بات ہے ؟ تم سب لوگ پریشان کیوں نظر آتے ہو ؟ رخشندہ کیوں موت کی طرح زرد نظر آ رہی ہے ؟

رخشندہ : آپ یہاں نہیں تھے۔ آپ یہاں نہیں تھے۔

آپ : میں اور کہاں تھا، رخشندہ ؟ اتنے طوفان میں میں باہر کیسے جا سکتا ہوں ؟

رخشندہ : آپ کدھر چلے گئے تھے ؟

آپ : میں تم سے ایک ہاتھ کی دوری پر تھا۔ اے مضطرب روح ! میں ہمیشہ ایک ہاتھ کی دوری پر رہتا ہوں۔ لیکن تم مجھے پانے کے لیے اپنا ہاتھ نہیں پھیلاتیں۔

رخشندہ : یہ کیسے ممکن ہے۔ (حیران ہو کر) ایک ہاتھ کی دوری پر فقط ایک ہاتھ — !

آپ : میں ہمیشہ تم سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر ہوتا ہوں رخشی !

رخشندہ : آپ . . . . آپ نہیں ہیں — نہیں ہیں — مجھے جزیروں میں انھیں ڈھونڈنے جاؤں گی . . . انھیں ڈھونڈنے جاؤں گی۔

(چھڑا کر چلی جاتی ہے۔ دروازہ کھلتا ہے اور بھگدڑ سی مچ جاتی ہے، گھر کے سب فرد رخشندہ کے پیچھے دوڑتے ہیں)

اماں جان : میری بیٹی !

دولہا بھائی : (بھاگتے ہوئے) رخشندہ ! رخشندہ !!

بھائی جان: (بھاگتے ہوئے) رخشندہ!

ننھے میاں: (روتے ہوئے) آپا!

بھابی: (آنکھوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے) اوہ! میں تاب نہیں لا سکتی۔

آپا جان: (بستر پہ گرتے ہوئے) میرا گناہ ہے۔ سب میرا گناہ!

(دروازہ کھلنے پہ طوفان کی ہیبت ناک آوازیں آتی ہیں جن میں ان لوگوں کا شور شامل ہو جاتا ہے کچھ دیر بعد ایک چکا چوند پیدا کرنے والی روشنی نظر آتی ہے جس کے بعد اندھیرا چھا جاتا ہے —!)

ایک عورت کی ”نہ“

ہردے ناتھ تیواڑی	:	مصنّف
وسنتی	:	ہردے ناتھ کی بیوی
پروفیسر مسز گپتا	:	مقامی گرلز کالج کی پروفیسر اور تیواڑی کی مدّاح
مدن	:	ہردے ناتھ کا دوست

منظر

/

پردہ اٹھتا ہے۔ تیواڑی کا رہائشی کمرہ جس کا ایک دروازہ مطالعہ کے کمرے اور دوسرا رسوئی میں کھلتا ہے۔ رہائشی کمرے میں ایک بڑا سا کوچ پڑا ہے جس کے دائیں یا بائیں طرف ایک نفیس سنگار میز رکھی ہے۔ سنگار میز پر شیشے کے قریب کریم، اسنو، آفٹا روز، ہیئر کریم کی نیلی شیشی، کیوٹکس نیل پالش، اور دوسرا آرائش کا سامان پڑا ہے۔ اس بات کا خیال رہے کہ سینٹ، پاؤڈر اور کنگھی آرائش کے سامان میں نہ رکھی جائے بلکہ ان میں سے ہر ایک چیز ضرورت کے مطابق میز کی دراز میں سے نکالی جائے...... قریب ہی ایک کھونٹی پر دو میلی سی دھوتیاں اور ایک نفیس ساڑی ٹنگی ہوئی ہے۔

صوفے کے قریب، ایک ہشت پہلو میز پر چند کتابیں عمداً بے ترتیبی سے بکھیر رکھی ہیں ـــــ تیواڑی مطالعے کا ماحول پیدا کرتے ہوئے پڑھتا ہے۔ پردہ اٹھنے پر مدن ایک کتاب لیے کوچ میں دھنسا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے قریب ہی تیواڑی صاحب ایک گیت گنگنا رہے ہیں (آج انھوں نے ایک قابلِ تحسین ناٹک لکھا ہے جس کا ناٹک ناد گانا کوئی ہو جائے۔ لیکن ڈرامہ اسی قسم کا ـــــ ہم تو ڈرتے ہیں کہیں سے بدلتے ہوئے ـــــ ہو جائے تو بہتر ہے) آہستہ آہستہ مدھم پڑتا ہوا سینٹ ہوا میں تبدیل ہو جاتا ہے اور پھر مدن اور تیواڑی کے پاؤں کی تھاپ کا ساز کی مترنم تال پر آتی ہوئی آواز ہم پر آ جاتی ہے

تیواڑی، آج سچ مچ زندگی کتنی دلچسپ معلوم ہوتی ہے!

مدن : ایک کامیاب ناٹک لکھ لینے کے بعد ؟ ہاں زندگی میٹھی کیوں نہ معلوم ہو کھائی!

تیواڑی : سچی بات ہے مدن، مجھے اپنے ہاں ننھے بھاشی کے پیدا ہونے پر اتنی خوشی نہ ہوئی تھی جتنی آج ہو رہی ہے

مدن : (تیواڑی کے قریب جا کر بیٹا ؤ تو بھلا کیا لکھا ہے؟

تیواڑی : نام بہت سندر ہے ناٹک کا — "عورت کی نہ!"

مدن : ایک عورت کی نہ ؟ کیا مطلب ہے تمھارا ؟ — ویسے نام تو بہت اچھا ہے!

تیواڑی : مطلب یہ ہے کہ ایک عورت کی نہ — ہاں کے برابر ہوتی ہے۔

مدن : (ہنستا ہے) لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا ————

تیواڑی : عام طور پر ہوتا ہے۔ تمھیں بائرن کا وہ مصرع یاد ہے :

AND WHISPERING—"I SHALL NEVER CONSENT—CONSENTED"

کرتی تھی نہ مانوں گی مگر مان گئی — ناٹک میں ودیا کا کردار بہت اچھا رہا ہے۔ دراصل میں اپنی تحریر میں بہت گہری طنز لانی چاہتا ہوں (فلسفیانہ انداز میں) میں انسان کو دیوتا کی صورت میں نہیں دیکھتا۔ اس کی سرشت میں بسی ہوئی بربریت اور وحشی پن کو دیکھتا ہوں اور عورت کو سر سے پاؤں تک ایک فریب کار ہستی — ایک الوژن — مایا — بس مایا —! (رازدارانہ لہجے میں) اور ایک بات کہوں تم سے ؟ "ایک عورت کی نہ" میں نے مسز گپتا سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔

مدن : (منہ کھلے کا کھلا رہ جاتا ہے اور آنکھیں پھیل جاتی ہیں) مسز گپتا ؟ مسز گپتا سے ؟ وہ تو بڑی مداح ہے تمھاری۔ اس بیچاری کو خواہ مخواہ کیوں اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہو ؟ . . . . . اور اگر اسے پتا چل گیا تو

تمہارے خلاف ہو جائے گی اور پھر تمہارے ڈرامے اور تمہاری کہانیاں
بھی رتن اور پربھاکر کے انتخابوں میں شامل ہونے سے رہیں جانتے ہو
کتنا مالی نقصان ہوگا تمہارا؟

تیواڑی: بلا سے۔ پہلے کون سے اسکائی اسکریپر بنا لیے ہیں جو ڈھے جائیں گے بیسویں
صدی کی ہر تعلیم یافتہ عورت کی طرح مسز گپتا بھی تو بچوں کے نام سے کوسوں
دور بھاگتی ہے۔ میں سوچتا ہوں آخر اس دنیا کا ہوگا کیا؟

(رسوئی میں وسنتی ایک طرف سے دوسری طرف جاتی ہوئی
دکھائی دیتی ہے۔ اس نے ایک نفیس ساری پہن رکھی ہے)

مدن: (آہستہ سے) کون ہے؟

تیواڑی: نہ جانے کون ہے کوئی دوسری مرتبہ اِدھر سے اُدھر گزرا ہے۔ میرے خیال
میں تو وسنتی ہے۔ نہیں تو دایہ ہوگی۔

مدن: ہاں ہاں یہ شاید بھابی ہی ہیں۔ بڑی مشغول دکھائی دیتی ہیں آج۔

تیواڑی: اوہ! اب میں سمجھا۔ وہ اندر آنا چاہتی ہے۔ اس کمرے میں۔۔۔ اکیلے بیٹھے
بیٹھے اکتا گئی ہوگی بیچاری! سچ پوچھو تو وہ تمہارے لطیفے بہت پسند کرتی ہے
مدن۔ تمہارے چلے جانے کے بعد تمہاری گپوں اور تمہارے فقروں کو بڑے
چٹخارے لے کر دہراتی ہے۔ تمہاری تعریف کے پل باندھا کرتی ہے کہتی ہے
جو عورت اس آدمی سے وابستہ ہوگی وہ بہت سکھی رہے گی۔ اور یہ وسنتی پر
ہی موقوف نہیں ہر ایک عورت دوسرے مرد کی باتوں کو پسند کرتی ہے۔

مدن: (قہقہہ لگاتے ہوئے) عجیب ہو تیواڑی، تم بھابی کے متعلق کبھی ایسا
کہنے سے نہیں چوکتے۔ بہت بڑھ گئے ہو تم اور کتنے ظالم ہو۔ ابھی ابھی تم نے
خود ہی کہا تھا کہ انسان میں بربریت اور وحشی پن بہت ہوتا ہے۔ سو ٹھیک کہا

کھا تم نے۔

تیواڑی: (بدستور سنجیدہ آواز میں) لیکن عورت کو بھی تو فریب کار کہا تھا۔

مدن: (ہنستے ہوئے) وہ بھی بہت حد تک درست ہوگا۔ لیکن مرد کے لیے کبھی تو دوسری عورت کی آواز نغمہ سے کم نہیں ہوتی۔

تیواڑی: اسی لیے تو میں کہتا ہوں۔ وسنتی بھی عام انسان کی کمزوریوں سے مستثنیٰ نہیں۔ گو میں اس بات کا اعتراف ضرور کرتا ہوں کہ اکثر عورتوں کا اپنی نئی ساڑی دکھانے، نئی سینڈل کی نمایش کرنے اور چند تحسین کی نگاہیں حاصل کرنے کے سوا اور کچھ مطلب نہیں ہوتا۔۔۔

(وسنتی پھر دروازے کے قریب آتی ہوئی دکھائی دیتی ہے)

لو اب وہ آیا ہی چاہتی ہے۔ وہ تمھارے قریب آ بیٹھے گی۔ تم خواہ کسی ڈھب کی باتیں کرو۔ وہ دل چسپی ظاہر کرے گی۔ تم خواہ کسی زبان میں گفتگو کرو وہ ایسا ظاہر کرے گی گویا سب کچھ سمجھ رہی ہے، اور وقتاً فوقتاً ایک آدھ قہقہہ بھی لگائے گی۔

(وسنتی بالآخر چلی ہی آتی ہے اور اندر آتے ہوئے نہایت شیریں لہجے میں تیواڑی سے خطاب کرتی ہے)

وسنتی: دیکھیے نا، آپ کا بٹوا چارپائی کے نیچے گر پڑا تھا، لیجیے سنبھالیے۔ پھر خواہ مخواہ ہندستانی بیویوں کو کوستے پھریں گے کہ وہ ہمیشہ خاوندوں کی جیبوں کی تلاشی لیتی ہیں اور انھیں شوہر کی ایمانداری سے دی ہوئی رقم پر قناعت نہیں ہے۔

(کچھ دیر بعد یوں ظاہر کرتے ہوئے جیسے انھوں نے سچ مچ مدن کو ابھی دیکھا ہے)

(دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)

تیواڑی: کون ہے؟ ٹھہرو میں جاتا ہوں دیکھنے کے لیے۔

(بائیں طرف جاتا ہے)

آواز: مدن جی یہیں ہیں کیا؟

تیواڑی کی آواز: یہیں ہیں بھائی ... کوئی ضروری کام ہے کیا؟

آواز: جی ہاں، بہت ضروری کام ہے گھر پہ۔ مجھے ماتا جی نے بھیجا ہے۔

(واپس آتا ہے۔ مدن واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے)

وسنتی: ایسا بھی کیا ضروری کام ہے مدن جی؟

مدن: نہیں بھابی، بس میں چلتا ہوں۔ ماتا جی کی طبیعت کچھ اچھی نہیں ہیں انھیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔

وسنتی: کیوں نہیں بسا لیتے اپنا گھر۔ دروازہ کھلا رہے گا اور ماتا جی کی خبر گیری بھی ہو جائے گی ——

مدن: (ایک سرد آہ بھر کر) اب بسانا ہی پڑے گا اپنا گھر!

تیواڑی: (آتے ہوئے) بس پھر چلے تم مدن؟

مدن: جی ہاں، بھائی معاف کیجیے گا میں آپ کو لطیفے پھر کبھی سنا دوں گا۔

وسنتی: کوئی بات نہیں، میں خود چلتی ہوں بھاسنی کہیں حوض میں نہ گر جائے، چاول چولھے پہ رکھے ہیں کہیں گل نہ جائیں۔

مدن: (جاتے ہوئے) یہ آپ کی ساری تو بہت نفیس ہے۔ اس رنگ پہ سنہرا باڈر بہت اچھا دکھائی دیتا ہے۔ علی بھائی سے خرید کی ہوگی، ہے نا؟ میں بھی اپنی بیوی کو خرید دوں گا، ایسی ہی ساری۔

جی تو بہت نفیس ہیں۔ اسی روپے۔ محلے کی ہر عورت نے پسند کی ہے۔

تیواڑی : اور محلے کے مردوں نے بھی پسند کی ہے۔

(سب ہنستے ہیں — مدن چلا جاتا ہے)

وسنتی : میں وہ گھر کے کام کی کاج والی دھوتی پہن لوں۔

(اندر جا کر میلی کچیلی دھوتی باندھ لیتی ہے۔ اس اثنا میں تیواڑی گنگناتا اور کتابوں کو الٹتا پلٹتا رہتا ہے۔ میلی دھوتی پہن کر وسنتی پھر اُسی کمرے میں آجاتی ہے)

تیواڑی : تم نے ساری تو خوب پہنی۔

وسنتی : شکر ہے ایشور کا۔ . . . آپ کو بھی کچھ پسند آیا ——

تیواڑی : گویا میری ہی پسند کا تو خیال رہتا ہے تمھیں . . . . میرے لیے ہی پہنی تھی تم نے ساری۔ تبھی تو مدن کے جانے کے بعد فوراً اتار کر بھی پھینک دی، اور باندھ لی یہ میلی کچیلی دھوتی —— جیسے نیلن کبھی نہ باندھے کوئی۔

وسنتی : اور کیا کرتی ——؟ کام کاج میں بھی ساری ہی پہنے رہتی —— نوکر لا دیجیے، تو میں اب بھی پہن لیتی ہوں وہی ساری۔

تیواڑی : اور تم نے بہانہ بھی تو خوب بنایا ——

وسنتی : بہانہ کس بات کا؟

تیواڑی : اندر آنے کا، بٹوے کا بہانہ . . . . .

وسنتی : میں یہاں آنا ہی کب چاہتی تھی؟

تیواڑی : اور آ بھی گئیں!

وسنتی : میں یہاں بیٹھنا کب چاہتی تھی؟

تیواڑی : اور بیٹھ بھی گئیں۔

وسنتی : میں کہتی ہوں آپ بڑے خراب آدمی ہیں۔

تیواڑی: جی ہاں۔ ہوں تو خراب ہی!

وسنتی: (بگڑ کر) اچھا یوں ہی سہی۔ مان لیجیے، میں خود آنا چاہتی تھی۔

تیواڑی: تو بٹوے و لوٹے کا بہانہ تراشنے بغیر بھی تو آسکتی تھیں۔ صاف طور پر کہہ دیتیں۔ بھئی مجھے تمہاری باتوں سے بہت ہی دلچسپی ہے۔

وسنتی: کس کی باتوں سے دلچسپی ہے مجھے؟

تیواڑی: مدن کی باتوں سے اور کس کی باتوں سے!

وسنتی: چھی! آگ لگاؤ اس کی باتوں کو... میں تو آپ کے کہنے سے بیٹھ گئی تھی۔ میں نہ کہتی تھی کہ بھاشی حوض میں گر جائے گا اور چاول گل جائیں گے ورنہ میں تو...

تیواڑی: ہاں "ورنہ"، کے پردے میں پیٹنا تو تمہاری فطرت ہے۔ آپ ہی آپ بیٹھ جاتیں تو تم شاید اپنے آپ کو بے وقعت سمجھتیں۔ تم عورتوں کو موڑ توڑ کر باتیں کرنے اچھے اچھے فقرے کہنے میں بہت لطف آتا ہے نا... عورتیں فطرتاً ہی سانٹھ گانٹھ پسند کرتی ہیں ——

وسنتی: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

تیواڑی: جی ہاں —— کیا کہہ رہا ہوں میں؟ اب یہ باتیں کیا سمجھو گی تم۔ اس وقت یوں ہنس رہی تھیں جیسے سب کچھ سمجھ رہی ہو —— اس وقت تو فرانسیسی، اطالوی تک سمجھنے لگی تھیں۔

وسنتی: (کانوں کو ہاتھ لگا کر) میرے ایشور! بڑے وہمی ہیں آپ تو!

تیواڑی: جانتا تھا کہنے پر یہی الزام لگاؤ گی۔ بلکہ ابھی تک تم نے مجھے حاسد نہیں کہا۔

وسنتی: (جھلا کر) میں جاتی ہوں۔ میرے چاول ——

تیواڑی: ہاں ہاں! گل گئے ہوں گے تمہارے چاول!

وسنتی: ننھا بھاشی۔ ——

تیواڑی: ہاں، ہاں! حوض میں گر پڑا ہوگا ننھا بھاشی ......

وسنتی: میں کہتی ہوں آپ بات بھی کرنے دیں گے مجھے؟

تیواڑی: بھاگ تو تم رہی ہو —— اب کاہے کو بیٹھو گی میرے پاس دراصل اب یہاں ہے ہی کون؟ —— مدن تو ...

وسنتی: (سٹپٹا کر بیٹھ جاتی ہے) لو بیٹھ جاتی ہوں بابا...... میرا کہنا ہے چاول گل جاتے ہیں تو گل جائیں۔ پھر نہ کہنا۔ یہ کیسے چاول ہیں؟ گوبر ہیں...... اور وہ ہر وقت کے طعنے کہ تمھیں کھانے پکانے کا ذرا بھی سلیقہ نہیں۔ اور بھاشی؟ —— ہاں بھاشی حوض میں ڈوبتا ہے تو ڈوب جائے۔ وہ میرا بھی اتنا ہی بیٹا ہے جتنا آپ کا!

(آواز بھرا جاتی ہے۔ پھر وسنتی دھوتی کے پلّے سے اپنا منہ چھپا لیتی ہے)

تیواڑی: دیکھو وسنتی! اچھے وار مت کرو مجھ پہ اور... میں روز روز نہیں منانے کا تمھیں۔

وسنتی (روتی آواز میں) کہتا کون ہے آپ سے؟

تیواڑی: (کچھ دیر بعد) سچ مچ ناراض ہو گئیں۔

وسنتی: (اسی طرح) آپ باتیں جو ایسی کرتے ہیں، دل جلا دینے والی۔

تیواڑی: (کمرے میں ٹہلتا ہوا گنگناتا ہے) روٹھا ہوا ہے کوئی، کوئی منا رہا ہے

(کچھ دیر بعد)

آؤ صلح کر لیں وسنتی، وہ سب کچھ مذاق میں تھا —— جانے بھی دو

وسنتی ! . . . .

وسنتی : اب کون منّت کرتا ہے آپ کی ؟ جائیے کیجیے اپنا کام !

تیواڑی : اِدھر دیکھو وسنتی ! یہ چھوٹی موٹی جھپٹ محبت میں اضافہ کرتی ہے ——— اور پھر ——— گُدگُدا کے بھی ہنساتے ہیں ہنسانے والے ——— !

(تیواڑی گدگدانے کے لیے بڑھتا ہے۔ وسنتی اُچھل کر ایک طرف کھڑی ہو جاتی ہے، پھر دونوں ہنسنے لگتے ہیں)

تیواڑی : (کچھ دیر بعد) دیکھو، آج وہ تمھارے ڈاکٹر لانبے آرہے ہیں (لفظ تمھارے پر زور دیتا ہے)

وسنتی : تمھارے کا کیا مطلب ؟

تیواڑی : اوہ ! تمھارے . . . . . ہیں تو وہ دوست میرے ہی لیکن تمھیں ان کی باتیں بہت پسند آتی ہیں نا۔ جب انھوں نے اپنے کالج کے دنوں کا ایک رومان سنایا تھا تو کتنی خوش ہوئی تھیں تم۔ اور تم نے آپ ہی تو اعتراف کیا تھا کہ کتنا اچھا آدمی ہے۔ اس کے ساتھ جو عورت شادی کرے گی وہ گویا سورگ میں رہے گی۔

وسنتی : (بگڑ کر) تو کیا جھوٹ کہا تھا میں نے ؟

تیواڑی : اجی جھوٹ موٹ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بات یہ ہے کہ ہر دوسرے مرد کی عورت سورگ میں رہتی ہے ——— ۔

وسنتی : (جل کر) سورگ کو سدھار جاتی ہے۔

تیواڑی : جی ہاں ! یہ تو ایسا کہہ رہی ہو نا !

وسنتی : ہاں ——— !

نیواڑی: اچھا تو یوں ہی سہی —— آج وہ میرے ڈاکٹر لانبے آ رہے ہیں۔ (لفظ میرے پر زور دیتا ہے)

وسنتی: تو میں کیا کروں، مجھے کیا غرض؟ میں نے کون سے تھال پروس رکھے ہیں اُس کے لیے ——؟

نیواڑی: پھر وہی بات خواہ مخواہ جھگڑے کی —— اجی شریمتی جی، میں کہتا ہوں تمھیں سیر کروا لائیں گے۔ ذرا ان کے ساتھ ہوا خوری کے لیے چلی جانا۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔ تمھاری طبیعت جو ہر وقت میری وجہ سے مضمحل رہتی ہے اچھی اچھی باتیں سننے سے بہل جائے گی۔ اور پھر تم اچھی سے اچھی ساری پہنو گی۔ کہو، تمھیں مدن سے سینما کا پاس منگوا دوں؟

وسنتی: (غصّے سے) میں نہیں جاؤں گی —— میں کبھی کسی کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ اب نہ کسی کی موجودگی میں آ کر بیٹھوں گی۔ نہ کسی کی بات پر ہنسوں گی نہ کسی کے دُکھ پر روؤں گی۔ میں نہیں جانتی تھی آپ کا دل اتنا چھوٹا ہے۔

(آواز پھر بھرّا جاتی ہے)

.... اپنی باری یاد نہیں ہے۔ مسز گپتا کے ساتھ کس طرح گھل مل کر باتیں کرتے ہیں۔ جب وہ آتی ہے تو میری رُوح جل اُٹھتی ہے۔ اُس کا ہار پسند کیا تو مجھے بھی ایک لا دیا —— پہلے ہی لا دیتے تب میں جانتی —— اُس دن اکیلے ہی سینما چلے گئے۔ واپس آئے تو کہنے لگے آج تم مجھے بالکل فلاں ایکٹرس دکھائی دیتی ہو اور پھر لگے مجھ سے گھل مل کر باتیں کرنے۔ سامنے وسنتی اور دماغ میں مس فلاں —— اسے تمھاری ویاکرن میں بہن کم کہتے ہیں۔ اب میں خوب سمجھتی ہوں تمھاری ان باتوں کو.....

نیواڑی: دیکھو وسنتی! —— خواہ مخواہ الزام لگا رہی ہو ——!

وسنتی : (رندھے ہوئے گلے سے) اور آپ تو میرے ساتھ بہت ہی اچھا سلوک کر رہے ہیں ہے نا ؟

تیواڑی : میرا کام ہر ایک کی فطرت دیکھنا ہے۔ میں تمھیں دیکھتا ہوں، مسز گپتا کو دیکھتا ہوں۔ اگر تمھیں پتا ہو کہ میں نے اپنے نئے ناٹک میں مسز گپتا کی سی تعلیم یافتہ مگر بچوں کے نام سے کوسوں دور بھاگنے والی بیسویں صدی کی عورت کی کتنی گت بنائی ہے تو تم حیران رہ جاؤ ——

وسنتی : جی ہاں —— جانتی ہوں، وہ تو صرف لکھنے میں ہے نا !

تیواڑی : اوں ہوں —— !

وسنتی : ہوں ! جانتی ہوں —— یوں تو اس پر جان دیتے ہیں، اسے دل سے چاہتے ہیں۔

تیواڑی : اتنا ہی جتنا تم ڈاکٹر لانبے کو چاہتی ہو۔

وسنتی : (زور سے) خاموش ! ایسی باتیں مجھے بالکل نہیں بھاتیں۔ .. مجھے آپ ...... مجھے اس موئے ...... نگوڑے کی شکل تک سے نفرت ہے ! سخت نفرت !!

تیواڑی : مجھے بھی مسز گپتا ایک آنکھ نہیں بھاتی، ایک آنکھ !

(دونوں ہنس دیتے ہیں)

وسنتی : باتیں ہیں ——

تیواڑی : ہاں باتیں ... (کچھ سوچتے ہوئے) آ .... آ .... میں کہہ رہا تھا ؟

وسنتی : میں کیا جانوں، کیا کہہ رہے تھے ——

تیواڑی : ہاں میں تم سے کچھ کہنے والا تھا، بھول گیا —— اوہو ! کچھ یاد ہی نہیں آتا —— !

(کچھ دیر بعد)

میری یادداشت بدن بدن کمزور ہوتی جا رہی ہے۔

وسنتی: وہی نگوڑے ڈاکٹر لانے کا ذکر کر رہے تھے۔ کدھر کے کدھر بھٹک گئے۔

تیواڑی: (تالی بجاتے ہوئے) اوہاں، بہت اچھّی ہے یاد تمہاری ــــ خاص طور پر جبکہ ــــ ہاں، آج شام کو وہ یہاں آئیں گے۔ دیکھو ایک بات کہے دیتا ہوں وسنتی ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے ایک اور کھیل نیا ناٹک شروع کیا ہے "تاک جھانک"، اس کا نام ہے۔ میں چاہتا ہوں کل تک اسے ختم کر ڈالوں۔ دو سین تو میں نے لکھ بھی لیے ہیں ــــ وہ آئیں گے تو کہہ دینا میں گھر پر نہیں ہوں۔ بولو، کیا کہو گی؟

وسنتی: یہی کہوں گی، اپنے کمرے میں بیٹھے تاک جھانک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

تیواڑی: سش سش ۔ ۔ ۔ بہت بُری ہو تم!

وسنتی: جی ہاں، ہوں تو بُری ہی ــــ

تیواڑی: دیکھو منّت سے کہتا ہوں اُن سے کہہ دینا کہ میں آج گھر پر نہیں ہوں۔ تم جانتی ہو میرے سر میں صبح سے تھوڑا تھوڑا درد ہو رہا ہے۔ ناٹک لکھتا رہا ہوں صبح سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جا کر ذرا چمنی پیس پر سے اسپرین کی ٹکیہ تو لا دو۔

وسنتی: میں کہتی ہوں زیادہ اسپرین نہیں کھانی چاہیے۔

تیواڑی: میں تو جیسے ہر روز ایک ٹکیہ ہی اسپرین کی کھاتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کوئی حرج نہیں ــــ میرا کہا یاد رکھو گی نا؟ اور دیکھو ذرا بیر کو بھیج کر مدن جی سے دو پاس منگوا لینا اور ڈاکٹر صاحب کے ساتھ

سینما چلی جانا۔ شام اچھی گزر جائے گی۔ ہمارے مقدر میں تو رونا پیٹنا لکھا ہے تمھیں بھی اپنے ساتھ کیوں رلاؤں؟ بھاشی کو دایہ کے حوالے کر دینا۔ سمجھیں؟ ذرا باغ میں گھما لائے گا۔ آئے گا تو دودھ میں پلا دوں گا شیشی کہاں رکھی ہے؟ —— فیڈر —— اور نپل کہاں ہے نپل؟ مجھے بتاتی جانا۔

وسنتی: میں نے جانے کی رضامندی کب ظاہر کی ہے؟

تیواڑی: دیکھو، مانا بھی کرتے ہیں۔ یوں تنگ نہیں کیا کرتے —— میں کہتا ہوں آخر اس میں حرج ہی کیا ہے ——؟

وسنتی: اُوں ہُوں، میں تو کبھی نہیں جانے کی —— مدن سے باتیں کرنے میں کیا حرج تھا؟

تیواڑی: اُف ایشور! وہ تو سب کچھ مذاق میں تھا۔۔۔ دیکھو، ذرا ساری اچھی پہننا۔ بانکی لگو۔ وہی جس میں ساڑھے تین انچ چوڑا بارڈر لگا ہے علی بھائی کے یہاں سے لائے تھے —— ہاں ہاں وہی —— مسکرا رہی ہونا۔ بڑی اُستاد ہو۔

(دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)

وسنتی: دیکھیے کوئی آیا ہے۔

تیواڑی: ڈاکٹر لاہنے کے سوا اور کون ہوگا؟

وسنتی: اُف، میں تو میلی سی دھوتی باندھے بیٹھی ہوں۔

(گھبرا کر دوسرے کمرے کی طرف جاتی ہے)

وسنتی: (دور سے) نئی دھوتی ہی کوئی نہیں۔ اور یہ دونوں میلی ہو چکی ہیں بہت میلی شلوار —— ساڑی ہی باندھ لیتی ہوں۔ وہی جو آپ کو پسند

ہے۔

تیواڑی : ہاں ہاں وہی باندھنا جس میں ساڑھے تین انچ چوڑا بارڈر لگا ہے۔ علی بھائی کے یہاں سے لائے تھے ——— وہی۔

وسنتی : مسکرا رہے ہونا۔ بڑے استاد ہو۔

(دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)

تیواڑی : دایہ سے کہو وہی آواز دے دے ایک شریف آدمی نیچے کھڑا ہے۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔

(وسنتی ایک طرف جاتی ہے۔ اس کے کپڑوں کے لپیٹ میں آکر ایک کرسی گر جاتی ہے جس سے اس کے حواس باختہ ہونے کا خیال پیدا ہوتا ہے)

وسنتی : (دبی آواز میں) رامی ——— ارے رامی ——— مردار! نو بجے سے سو رہی ہے تو اٹھ۔ دیکھ باہر ڈاکٹر لانبے آئے ہیں۔ ان سے کہہ دے بابو جی گھر پر نہیں ہیں۔ باہر گئے ہیں۔ اٹھ جلدی سے اری اٹھ بھی (نسبتاً آہستہ آواز میں) دراصل آج بابو جی کے سر میں درد ہو رہا ہے۔ وہ جانا نہیں چاہتے۔ سارا دن بیچارے کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں۔

تیواڑی : رہنے دو اب۔ میں تمھاری ہمدردی نہیں چاہتا۔ رامی! کہہ دو گھر پر نہیں ہیں۔

وسنتی : کہہ دو بابو جی گھر پہ نہیں ہیں . . . . لیکن . . . بی بی جی ہیں۔

تیواڑی : اوہ۔ میں بھول گیا!

وسنتی : مسکرا رہے ہونا۔ بڑے استاد ہو۔ تم ہی نے تو کہا تھا۔ سینما . . . . .

تیواڑی : رامی! کہہ آپ آجائیں۔ بی بی جی کو آپ کے ساتھ باہر جانا ہے۔ سینما پاس

ہیں۔ دیکھو ٹھیک اسی طرح کہنا۔ ذرا دو منٹ" کہہ دروازہ کھولنا۔ آواز دیر دیہلے ——

وسنتی : میں نے کہا جی۔ کنگھی کہاں ہے؟ میرے بال بھی بکھر رہے ہیں۔

(وسنتی کی گھبراہٹ کا اندازہ میز کے ساتھ ٹھوکر لگنے سے ہوتا ہے۔ وہ اوئی کہکر لنگڑاتی ہوئی چلنے لگتی ہے۔ اور تیواڑی اس کے پاؤں کو دبانے لگتا ہے)

تیواڑی: کہیں بہت تو نہیں لگی، وسنتی!

(وسنتی اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد میز کے درازوں کو بار بار کھولتی اور بند کرتی ہے)

وسنتی : نہ جانے کنگھی کہاں رکھی ہے کمبخت؟ یہ موئے سبھاشی نے کہیں پھینک دی ہوگی ناک میں دم کر دیا ہے اس نے تو میرا۔ رہ چکی اس کی جان کو میں تو ——

تیواڑی: خفا کیوں ہوتی ہو؟ کنگھی میرے پاس ہے لو۔ . . . یہ لو۔ اور دیکھو اچھی طرح بنانا بال۔

وسنتی : مسکرا رہے ہو؟ بھلا بال بنانے میں کیا عیب ہے؟ آپ ہی کو کوئی کہے گا اتنے بڑے لیکھک کی بیوی کتنی اُجڈ ہے۔ خانہ بدوش عورتوں کی طرح بال بھی سیدھے نہیں کرتی۔

(ایک لمحہ بعد)

بال بناؤں گی اور دائیں طرف مانگ نکالوں گی، بالکل مسز گپتا کی طرح۔

تیواڑی: مسز گپتا سے اس کا کیا تعلق ہے؟ تم اپنا کام کیے جاؤ۔

وسنتی : (نخرے سے) اوہو! اُس کا نام لینا بھی گناہ ہو گیا اب!

(زور سے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)

تیواڑی: رامی سے کہو اب تو دروازہ کھول دے۔ ورنہ وہ بیچارا مایوس ہو کر چلا جائے گا۔

وسنتی: ٹھہرو۔ مجھے بال ٹھیک کر لینے دو۔ میرا۔۔ میرا۔۔ پاوڈر کبھی تو یہاں نہیں ہے۔ (میز کی دراز کو کئی مرتبہ کھولتی اور بند کرتی ہے)

تیواڑی: وہ سامنے تو پڑا ہے۔ ناحق گھبرائے جاتی ہو۔

وسنتی: (واپس آتے ہوئے) اوہ! میں تو سچ مچ ہی گھبرا گئی تھی۔ یہ ساری) اچھی لگتی ہے نا؟ مجھے آپ کی عزت کا بڑا خیال رہتا ہے۔ دیکھیے۔ بیوی شوہر کی عزت ہوتی ہے۔

تیواڑی: ہوں۔ میں کب انکار کرتا ہوں؟

وسنتی: تو اقرار کب کرتے ہیں؟ وہ میری سینٹ کی شیشی کہاں گئی؟ (گھبرا کر) جلدی بتائیے۔ اِدھر دیکھیے۔ اُدھر سہاشی ـــــ مُوا سہاشی ـــــ!

(سیڑھیوں پر قدموں کی آواز)

تیواڑی: (دبی آواز میں) لو وہ آ گئے سیڑھیوں میں۔ سنگار دان میں پڑی ہوگی تمھاری سینٹ۔

وسنتی: میں کہتی ہوں آپ اُس کے نام سے چڑتے کیوں ہیں؟ اس کے سامنے بس پگھلے جاتے ہیں۔ (اندرونی دروازے پر کھٹکھٹانے کی آواز)

تیواڑی: لو وہ آ ہی گئے۔ میں اپنے کمرے میں جاتا ہوں۔

(تیواڑی اپنے مطالعے کے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیتا ہے)

وسنتی: (دروازے کی طرف منہ کرتے ہوئے) آجائیے۔۔۔۔ آئیے، آئیے۔۔۔۔ (ڈاکٹر لال کی بجائے مسز گپتا نمودار ہوتی ہیں۔ وسنتی کا منہ کھلے کا کھلا

رہ جاتا ہے اور کریم کی شیشی ہاتھ سے گر کر ٹوٹ جاتی ہے)

وسنتی : اوہ، مسز گپتا! آپ۔ آیئے ——— آ..... آ... یئے ———

مسز گپتا : وسنتی جی۔ اوہ شیشی ٹوٹ گئی کریم کی۔ بیحد افسوس ہوا مجھے!

وسنتی : (ڈرکھائی سے) اوہ۔ کوئی بات نہیں بہن! ایک شیشی؟ یہاں تو بہت کچھ ٹوٹتا رہتا ہے اور کسی دن ———

مسز گپتا : کہیں جا رہی تھیں آپ؟

وسنتی : (سوچتے ہوئے) نہیں یونہی۔ صبح سے طبیعت کچھ پریشان تھی میں نے کہا ذرا ٹائلیٹ کر لوں۔

مسز گپتا : ہاں بہن۔ ٹائلیٹ کرنے سے انسان ——— تازہ اور شگفتہ ہو جاتا ہے بدن میں جان آجاتی ہے لیکن اتنا اہتمام؟ کریم، سینٹ ——— اور پھر کہیں جا بھی نہیں رہیں آپ! ——— تیواڑی جی تو گھر پہ نہیں ہیں۔

وسنتی : (گھبرا کر) وہ تاک جھانک ——— ابھی باہر گئے ہیں۔

مسز گپتا : تاک جھانک کیا کہنے لگی تھیں آپ؟

وسنتی : یہ ان کے نئے ناٹک کا نام ہے ——— "تاک جھانک" مکمل کرنے کے بعد گھر سے نکلے ہیں۔ ناٹک کا نام تو اچھا ہے کہتے ہیں اس میں بیسویں صدی کی ایک بچوں سے ڈرنے والی عورت.......

مسز گپتا : (سنی ان سنی کرتے ہوئے اور فتح مندی کے احساس سے) بہن تعجب ہے! آج تم نے میری طرح کیوں دائیں مانگ نکالی ہے؟

وسنتی : ہاں وہ ایسی مانگ پسند کرتے ہیں۔

مسز گپتا : سچ ———؟

وسنتی : ہاں سچ!

مسز گپتا: میرا تو ارادہ تھا کہیں باہر چلیں۔
وسنتی: مگر وہ گھر پہ نہیں ہیں۔
مسز گپتا: ہاں جانتی ہوں۔ رامی نے بتا دیا تھا..... ذرا دیر ہوتے... تم ہوتیں تو رونق ہو جاتی۔
وسنتی: گھر سے نکلنا تو گرہستن کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔ بہت مشکل۔ نہ جانے عورتیں کیسے بچوں کو نوکروں کے حوالے کر کے تین تین چار چار گھنٹے باہر گھوم آتی ہیں۔ عورت کو تو اپنے گھر اور بچوں ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ میں تمھارے ساتھ چلی ہی جاتی لیکن میرے پاؤں میں کچھ موچ آ گئی ہے اور پھر چولھے پر کچھ چاول رکھے ہیں ——— (کمرے کے اندر سے آواز آتی ہے)
تیواڑی: ڈر ہے کہیں گل نہ جائیں چاول۔
وسنتی: (گھبرا کر) ننھا بھاشی گلی میں کھیل رہا ہے۔
تیواڑی: ڈر ہے کہیں حوض میں نہ گر پڑے۔
مسز گپتا: (خوش ہو کر) تیواڑی جی کی آواز!
(دروازہ کھلتا ہے۔ تیواڑی باہر آتے ہیں)
تیواڑی: گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مسز گپتا۔ معاف کیجیے گا میں گھر پر نہیں۔ یعنی ان سے میں نے ہی کہا تھا کہ کہہ دینا میں باہر چلا گیا ہوں۔ بات یوں ہے کہ ایک ناٹک شروع کیا تھا۔ دیکھیے نا۔ لوگ آتے ہیں میرا وقت ضائع کر کے چلے جاتے ہیں۔ پوچھو بھئی کیا کام ہے تو بس یہی صاحب آپ کے درشن کرنے ہیں۔ خیر آپ کی تو علاحدہ بات ہے بالکل علاحدہ۔ میری ٹوپی کہاں ہے وسنتی؟
وسنتی: باہر جا رہے ہیں آپ۔ میں آپ کو ہرگز ہرگز باہر نہ جانے دوں گی۔ دیکھو بہن آج

ان کی طبیعت خراب ہے۔ صبح سے سر میں درد ہو رہا ہے۔ ابھی ابھی اسپرین کھائی ہے اور اب باہر بھی جانے لگے۔

تیواڑی: جانے دو ——— ایک گھنٹہ ہوا اسپرین کھائے اور ———

وسنتی: میں کہتی ہوں ہوا لگ جائے گی اور زیادہ بیمار ہو جائیں گے آپ۔

تیواڑی: چھوڑو اس بات کو۔ بتاؤ میری ٹوپی کہاں ہے؟ ٹھنڈی ہوا میں گھومنے سے درد کافور ہو جائے گا۔ وہ علی بھائی والی ساری تم نے پہن رہی ہوئی ہے۔ بھاشی کو کھلانے کے لیے رامی لے ہی گئی ہے۔ دو تین گھنٹے سے پہلے کیا آئے گی۔ وہ جانتی ہے تاکہ اس سے پہلے پی پی سینما سے نہیں لوٹنے کی۔ بس اب چلو۔ مسز گپتا بھی چلیں اچھا رنگ رہے گا۔

(وسنتی کراہتی ہے)

وسنتی: مشکل ہے۔ میں نہیں جاؤں گی۔ آپ جائیں۔

مسز گپتا: آپ بھی چلیں بہن۔ کپڑے تو آپ نے پہنے ہی ہوئے ہیں لیکن بابا میں مجبور نہیں کرتی۔ اگر طبیعت چاہے تو شوق سے چلیں۔ صحت بھی دیکھنا لازمی ہے۔

وسنتی: اچھا تم جو اصرار کرتے ہو تو چلی ہی جاتی ہوں۔ لیکن اوہ ——— اُف ہائے!! میرے پاؤں کی موچ کا کیا ہوگا۔ میرے پاؤں... کی... موچ... کا کیا... ہوگا...؟

تیواڑی: ہوں! کیا ہوگا؟ ارے اٹھو چلو۔ راستے میں ڈاکٹر لانبے کو ساتھ لے لیں گے!

(پردہ)